Maiyar

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

جلد ــــــ ۵
نمبر ــــــ ۳

مارچ ۱۹۵۵ء

معیار

مدیر
نجم الاسلام

جملہ خط و کتابت، ترسیلِ زر اور تبادلہ کے لئے

دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیصل لائن جیکب آباد

ترتیب

نظمیں

مقالے

غزلیں

افسانے اور خاکے

مثنوی

خیال اپنا اپنا

نقشِ اوّل

ایک نئی ادبی تحریک جو نظم و ترتیب کے ساتھ بروئے کار آرہی ہے۔ اپنے معاونین سے کچھ مطالبے کر رہی ہے۔ کیا ہم نے اِن مطالبوں کو سننے سمجھنے اور پورا کرنے کا عزم کر لیا ہے؟ اس کا جواب آپ کو دینا ہے۔ آیئے ان مطالبوں کو سنیں سمجھیں اور پورا کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ اِس وقت ہمارے سامنے داخلی تیاری کے لحاظ سے کئی اہم باتیں ہیں۔

۱ ـــــ فکر و خیال کی قوتوں کا تخلیقی کاموں میں استعمال۔

۲ ـــــ تخلیقی تفکّر کا اِرتقاء۔ تعلیمی، اِصلاحی اور ادبی زاویوں سے۔

۳ ـــــ ادبی تحریک مزاج کی تشکیل اور مخصوص نصابیت کی پرورش۔

یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان موضوعات پر تفصیل سے کچھ کہا جاسکے۔ لیکن مجمل طور سے کہا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے تخلیقی کاموں کے مسئلے ہی کو لے لیجیۓ۔ اس پر عرصے سے کافی توجہ دی گئی ہے۔ ابتدائے کار میں بھی ہمارے یہاں بہت کچھ تخلیقی کام ہوا ہے۔ شعر و ادب کی بہت سی اصناف میں کامیاب تجربے کئے گئے ہیں۔ بہت سے تجربے ابھی کئے جاتے ہیں۔ ان تجربات کی بنا کیا رہی ہے؟ یہ سب جانتے ہیں۔ اِن تجربات کی بنا اِسلام کا ترکی تصوّر ہے۔ جو تعمیر پسند ادیبوں کے فکر و خیال کی قوتوں کو چلاتے رہا ہے۔ یہ تصوّر اپنے اندر اجتماعی تقاضوں کا پورا پورا شعور رکھتا ہے۔ اور یہی اس کا وصفِ امتیازی ہے۔

اب جبکہ ایک ادبی تحریک ایک مخصوص مزاج کی تشکیل کر رہی ہے۔ اپنے بنیادی تصوّر کے امتیازی اوصاف کو بھلا نہیں سکتی۔ اس وقت پہلے سے زیادہ گیرائی اور گہرائی کے ساتھ بنیادی تصوّرات کو نکھارنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے مطالعہ شرطِ اوّلیں ہے۔ مطالعہ کے بعد غور و فکر اور آزادانہ سوچ بچار کا مرحلہ آتا ہے۔ غور و فکر ہر کام کے لئے لازم ہے مگر ادبی کام چونکہ ایک تخلیقی کام ہے اس لئے یہاں غور و فکر کی نوعیت تخلیقی ہو جاتی ہے۔ اور اس کو تخلیقی تفکر (CREATIVE THINKING) کہا جاتا ہے۔ تخلیقی تفکر معمولی قوتِ غور و فکر سے قدرے مختلف چیز ہے۔ اس کے کچھ شرائط و ضوابط ہیں جنھیں پورا کرنا ضروری ہے۔ تخلیقی تفکر سب سے پہلے اعلیٰ درجہ کا نفسیاتی اور اخلاقی درک چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے جب بھی کسی کا ذہن اپنے فکر کو ترقی دینا چاہے گا۔ اسے دو مرحلوں سے گزرنا پڑے گا۔ ایک تعلیمی نفسیات کے نشیب و فراز سے دوسرے اصلاحی نفسیات کے اُتار چڑھاؤ سے۔ تعلیمی نفسیات اور اصلاحی نفسیات کی اصطلاحیں شاید اپنا مفہوم پوری طرح ادا نہ کرسکیں اور تشریح طلب ہوں۔ اس لئے یہ اشارہ ضروری ہے کہ تعلیمی نفسیات سے مراد نفسیات کا وہ مطالعہ ہے جس کے ذریعہ ہم ذہن کی داخلی ساخت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نفسیات بتاتی ہے کہ ذہن کی نشو و نما کن حالات میں ہوتی ہے۔ کیا کیا چیزیں اس کے لئے ضروری ہیں۔ قوتِ غور و فکر کن عوامل سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ابنِ خلدون کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جن کے یہاں اس طرف واضح اِشارے ملتے ہیں۔ جدید ماہرینِ نفسیات میں بھی بہت سے ناموں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایسے ماہرینِ تعلیم و نفسیات جو اخلاقی اور مذہبی رجحان کے لئے مشہور ہیں۔ ان میں ٹیگور کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ان سب نے تعلیمی نفسیات سے فائدہ اُٹھا کر ذہنی ترقی اور قوتِ فکر کی بالیدگی کے کچھ اصول اخذ کئے ہیں۔ ہمیں ان کے اصولوں پر ایمان نہیں لانا ہے۔ لیکن ان کے کئے ہوئے کام سے فائدہ اُٹھا کر اپنے لئے خود کچھ اصول اخذ کرنے ہیں۔ اور اپنے مزاج کے مطابق ذہنی تعمیر کی راہیں بنانی ہیں۔ اور اس کے لئے ان سب مفکرین اور ماہرینِ تعلیم کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

اس کے بعد ہم اپنے آپ کو اس پوزیشن میں لاسکتے ہیں کہ انفرادی خصوصیات کو نظر میں رکھتے ہوئے، ادب کے تخلیقی کام کی نوعیت کو سمجھ سکیں۔ اور تخلیقی تفکّر کے بنیادی اصولوں کو ادب کی پر منطبق کرسکیں۔ یہی ہمارا منشا ہے۔

محمد نیاز

عرضِ نیاز

ہم اے حریفو! زمیں پہ رہتے ہیں اور ہیں آسماں سے واقف
ہٹاؤ برقِ تپاں کے چرچے، کہ ہم ہیں برقِ تپاں سے واقف

یہ علم و فن کے نگار خانوں کی سیر و تفریح کرنے والے
اسی قدر آپ ہیں غافل، کہ جس قدر اِن و آں سے واقف

بڑا ہی دشوار ہے کہ فرقِ بیانِ عشق و ہوس کو سمجھو!
یہی بہت ہے کہ یہ گماں ہے کہ ہو زبان و بیاں سے واقف

گیا ہے گلچیں تو باغباں خود رواں ہے نقشِ قدم پہ اس کے
بتائے دیتے ہیں، پھر نہ کہنا کہ ہم نہ تھے باغباں سے واقف

کچھ اور تاروں کا خون پی پی کے تیرہ شب تیرہ تر ہوئی ہے
مزاجِ ہر ذرہ ہے تمھاری سحر گہِ ضوفشاں سے واقف

لیا ترے آستاں کا نام اور سنتے ہی لوگ مسکرائے
مراد یہ تھی کہ ہم سمجھتے۔ یہ ہیں ترے آستاں سے واقف

کسی زباں پر حذر نہیں ہے، کسی کو چنداں خطر نہیں ہے!
ابھی تو کوئی بشر نہیں ہے جنونِ آتش بجاں سے واقف

نہ منزلیں ہی نئی نئی ہیں، نہ کارواں ہی نیا نیا ہے
یہ کارواں منزلوں سے واقف یہ منزلیں کارواں سے واقف

صبا! بصد آفریں یہ تقریر پیشِ اخوانِ عصر کرنا
ہے وقت کا ہر شدید لمحہ تمھارے عزمِ جواں سے واقف

ابھی ہمارے خلاف کچھ ہی مشاغلِ دوستاں ہوں چھوڑو
یہ دوستوں سے کہو کہ ہم ہیں مشاغلِ دوستاں سے واقف

یہ پاسبانانِ ملک و ملت ہزار چوروں سے باخبر ہوں
وہ چور ہیں چور بھی کہ ہیں پاسبانیِ پاسباں سے واقف

حیات اظہار چاہتی ہے تو اہلِ دل منہ سے پھوٹتے ہیں!
وگرنہ دنیا میں کیا کمی ہے بہت ہیں شعر و بیاں سے واقف

تمھیں بھی دعویٰ ہے عشق ہی کا، ہمیں بھی دعویٰ ہے عشق ہی کا
تم آہ و نالہ سے بے خبر، ہم مذاقِ شور و فغاں سے واقف

خزاں کو فصلِ بہار کہہ لو، کہ تم ہو ناواقفِ حقیقت
وہ کیا کھلے گا رہا جو بے ڈر کے زندگی بھر خزاں سے واقف

یہ آب و گل کا فریبِ رنگیں، حسین دھوکا، خنک تماشا!
گئے وہ دن جب نظر نہیں تھی حقیقتِ جہوشاں سے واقف

یہ کون سی منزلِ طلب ہے، یہ کون سا عالمِ جنوں ہے
نیاز بے خانماں نہیں خود نیاز بے خانماں سے واقف

احقر بھٹناگر کانٹی پوری

کیا کروں؟

آج بھی دسترس سے بہت دور ہیں
نکہت و رنگ کے کارواں کیا کروں؛
شمع جلتی نہیں، نیند آتی نہیں
کس کو دوں اپنی تنہائیاں، کیا کروں؟
مجھ پہ تسکین کی ہر راہ مسدود ہے
پھر تخیّل کی محفل سجاؤں، تو کیوں؟
زندگی تیری میراث ہے تیرگی
روشنی کو نظر میں بساؤں تو کیوں؟
کون ہے کس کو آواز دوں، کیا کروں
رات کی لاش وزنی ہے، تنہا ہوں میں
وقت کہتا ہے چل، فرض کہتا ہے رک
کس مصیبت میں اس وقت الجھا ہوں میں
جھیل پر تیری نقرئی چاندنی
میرے احساس میں بجلیاں بھر گئی!
میں نے عنوان بھی جس کا سوچا نہ تھا
اُس افسانے میں رنگینیاں بھر گئی"

وقت کے روز و شب اُٹھتے طوفان میں
قافلے آرزوؤں کے گم ہو گئے!
چاند بجھتا رہا، دل سسکتا رہا
دھڑکنوں کے فسانے لہو رو گئے
منزلِ گم شدہ ڈھونڈنے کے لئے
مشعلیں لے کے آہوں کی نکلا ہوں میں
راہِ پُر خار کی مشکلوں کی قسم
اَن گنت بار گر گر کے سنبھلا ہوں میں
دور شمشان میں جل رہی ہے چتا
زندگی تیرے انجام پر شاد ہوں
حسبِ توفیقِ دل آہ و نالہ کروں
اِس غلامی میں بھی کتنا آزاد ہوں
خودکشی کر کے مر جاؤں یا چُپ رہوں
یا فلک بوس زرّیں مکاں پھونک دوں
اک اِشارہ تو دو میری ناکامیو
تم کہو تو میں سارا جہاں پھونک دوں

محمود عالم

سجدۂ شکر

خالق کون و مکاں
یہ ترے چاند ستارے یہ حسیں کاہکشاں
حسن و انوار کا یہ سیلِ رواں
ہر طرف رقص کناں
تیری قدرت تری عظمت تری وحدت کے نشاں
خالق حسنِ جہاں
تو نہاں ہے ترے جلوے ہیں عیاں
خالق کون و مکاں
کس قدر پاس تھا تو ــــ تجھ سے مگر دور تھا میں
کتنا بے نور تھا میں
خالق حسن بہار
یہ ترے نقش و نگار
آبشاروں میں مچلتے ہوئے نغموں کی پھوار
کوہساروں سے ابلتے ہوئے چشموں کا خمار
یہ حسیں چشمے ابلتے ہوئے کہساروں سے
گود میں وادیٔ گل پوش کے لہراتے ہوئے
پیچ و خم کھاتے ہوئے زلفِ پریشاں کی طرح
رقص کرتے ہوئے ہر موڑ پہ بل کھاتے ہوئے
جیسے فنکار کے سینے میں اچھوتا سا خیال

کتنے رومان بداماں ہیں ترے نقش و نگار
خالق حسن بہار
خالق چرخ و زمیں
یہ تری صبح دل آویز تری شامِ حسیں
سحر انگیز یہ نیرنگِ حسیں
یہ شفق زار حسیں نقش و نگارِ رنگیں
خالق چرخ و زمیں
تو حسیں ہے تری تخلیق حسیں
تیری تخلیق کا ہر جلوۂ صد رنگ حسیں
ریگزاروں میں یہ سنکے ہوئے طوفاں بھی حسیں
یہ گلستاں بھی حسیں تیرے بیاباں بھی حسیں
تیرے کانٹے بھی حسیں اور تری کلیاں بھی حسیں
نکہت و رنگِ بہارِ طرب انگیز حسیں
ذرے ذرے ترے جلوؤں کے امیں
خالق چرخ و زمیں
دیدۂ شوق نے آخر تجھے پہچان لیا
دلِ بے تاب نے منزل کا نشاں جان لیا
سجدۂ شکر سے لبریز ہے آج اپنی جبیں . . . .

افتخار اعظمی

جمال عبدالناصر

روشِ افرنگ کی سیکھی ہے کہاں سے تم نے
جو بھی حق بات کہے، اُس کو گرفتار کرو!

یہ بھی اندازِ محبت ہے تمھارا کیا خوب
خاطرِ دوست نہیں، خاطرِ اغیار کرو

وادیٔ غرب میں جو فتنے ہیں خوابیدہ انھیں
وادیٔ شرق میں اِس شان سے بیدار کرو

مدتوں سرد رہا مصر کا بازارِ ستم
تم جو آئے ہو تو پھر گرم یہ بازار کرو

تابہ کے آہ یہ آئینِ ہلاکت آموز
زندہ ہے مصر میں اب سنتِ فرعون ہنوز!

مصر سے تابہ کراچی ہوئی تجدیدِ ستم
گروہ شاہانِ ستم کیش نہیں ہیں، نہ سہی!

کیوں نہ ظاہر ہو ابوالہول کے چہرہ پہ نشاں!
مصر میں تازہ ابھی تک ہے وہی رسمِ شہی!

خوش ہیں مغرب کے جفا کیش کہ اب مشرق سے
رسمِ تہذیب اُٹھی، عظمتِ انساں نہ رہی

کیا قیامت ہے کہ ایران سے تا مصرِ جدید
جوئے خوں بادۂ گلرنگ کے مانند بہی!

کیا عجب دہر میں پھر آئے وہی بادِ بہار
جس سے ہو آتشِ نمرود گلستاں بکنار!
سینۂ نیل سے تازہ کوئی طوفان اُٹھے
مصر کی خاک سے پھر موسیٰ عمران اُٹھے

کیف نوگانوی

تہذیب جواں ہے!

شاہراہوں پہ یہ آوارہ جوانی کی بہار
یہ ہوسناک نگاہیں یہ دمکتے رخسار
یہ اشارے یہ کنائے یہ تبسم کے شرار
گوہرِ عصمت و اخلاق کہاں ہے ہمدم؟
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

درس گاہوں میں ہے تعلیم کا فرسودہ نظام
خانقاہوں میں جمود اور ہلاکت کا پیام
پیکرِ جہل و عداوت ہیں مساجد کے امام
ابنِ آدم ہدفِ وہم و گماں ہے ہمدم
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

اِک طرف دولت و ثروت پہ اجارہ داری
اِک طرف بھوک، جہالت، مرض و بیکاری
عصرِ حاضر کی سیاست ہے فقط عیاری
حاملِ عدل و مساوات کہاں ہے ہمدم؟
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

بے گناہوں کے لہو سے یہ زمیں ہے گلرنگ
دورِ الحاد کے عفریت ہیں آمادہ بجنگ
نعرۂ امن و مساوات پہ انساں ہے دنگ
زندگی تشنہ لب و شعلہ فشاں ہے ہمدم
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

پابہ زنجیر ہیں صد حیف زبان اور قلم
حق پرستی ہے جہاں میں حدفِ ظلم و ستم
کھل گیا عدل و مساوات و اخوت کا بھرم
شیطنت نغمہ زن و رقص کناں ہے ہمدم
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

شہزور کاشمیری

سوال و جواب

سوال

میری خطا معاف خداوندِ کائنات
آتی نہیں ہے میری سمجھ میں یہ ایک بات

قانونِ ہست و بود کی رو سے جہان میں
تکمیلِ روحِ عزم و عمل ہے اگر ممات

آتی ہے موت کس لئے پھر ایسے شخص کو
جو جی رہا ہو دہر میں بے مقصدِ حیات ؟

ہے مقصدِ حیات ہی اصلِ حیاتِ روح
یعنی مدارِ حوصلۂ دل ہیں خواہشات

جس دل میں اضطراب نہ ہو خواہشات سے
پیدا کرے وہ کیسے شعور اور حسیات ؟

مفقود جس کے قلب سے ہوں حسیاتِ زیست
کیونکر عمل کی اُس پہ مسلط ہوں کیفیات ؟

جس آدمی کے قلب میں ذوقِ عمل نہ ہو
تکمیلِ روحِ عزم کرے کیسے اُس کی ذات ؟

سمجھا تھا میں کہ موت ہے زندوں کے واسطے
مُردوں کو موت ، یہ تو ہے اوجِ عجائبات !

جواب

زندوں کو اُن کی موت ہے اِک نعمتِ حیات
مُردوں کی موت رحمتِ دنیائے ممکنات

ہے اُن کی موت اصل میں تکمیلِ روحِ عزم
اِن کی اجل شکستِ طلسماتِ ظنّیات

زندوں کو اُن کی موت سے آفاقیت نصیب
مُردوں کو موت مرگ ہے یعنی ضدِ حیات

نجم الاسلام

ہیمنگ وے

ہیمنگ وے امریکہ کا صفِ اوّل کا مصنف ہے جسے ۱۹۵۴ء میں ادبی خدمات کے سلسلہ میں نوبل پرائز دیا گیا۔ ہم میں سے بہتوں کے لئے ہیمنگ وے کا نام بالکل اجنبیت رکھتا ہے لیکن امریکی ادب میں اس کا مقام بہت اہم ہے۔ ادب اور تنقید کے بارے میں اس کا نظریہ بڑی حد تک اعتراض کے قابل ہے جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی ادبی صلاحیتیں ۱۹۲۴ء سے جبکہ اس نے پہلی بار اپنی کہانیوں کا مجموعہ "ہمارے وقت میں" (In our time) شائع کرایا برابر اہلِ نظر کے قابلِ تعریف پہلو تلاش کرتی رہیں۔ ... جس نظر سے دیکھا گیا اس نے ساری دنیا میں اس کی شہرت پھیلا دی۔ ہیمنگ وے کے بارے میں بہت سے مضامین شائع کئے گئے۔ بحثیں ہوتی رہیں لیکن اردو میں ابھی تک اس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ بہت سے لوگوں کا تعصب بھی ہو سکتی ہے۔ اگر نظریہ کا اختلاف اس بے توجہی کو روا رکھتا ہے تو شاید کہیں بھی اس مضمون کی اشاعت سے اعراض کرنا چاہئے تھا مگر حقیقت میں نظریہ کے اختلاف اور تعصب میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینا ہی غلطی ہے۔ ہیمنگ وے اچھا ... ہے یا بُرا، اس کا فیصلہ تجزیہ اور تحلیل کے بعد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بہر کیف وہ ایک ایسی ہوا ہے جس کی ... اکاڈمی کی توجہ ... دی گئی ہے۔ اس کے اثرات ظاہر ہیں ... خود وہی ہے۔

ہیمنگ وے کے بارے میں حال ہی میں ایک مختصر سا مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون ان خیالات پر مشتمل ہے جو اس نے ایک ایڈیٹر Harvey Breit سے انٹرویو کے دوران میں ظاہر کئے۔ یہ خیالات اس کے ادبی و تنقیدی رجحانات اور ... حقیقت سے متعلق ہیں۔ ہاروے بریٹ کا ... معلومات افزا ہے۔ اور ہیمنگ وے کی ادبی شخصیت کے بعض اہم پہلو ... پر روشنی ڈالتا ہے۔

نوبل پرائز ملنے کی خبر کا اثر ہیمنگ وے پر کیونکر ہوا، اس کے متعلق بریٹ ... اس طرح لکھا ہے۔

"ہوانا میں اکتوبر ۱۹۵۴ء کی اٹھائیس تاریخ کو موسم ... اور خوشگوار تھا۔ ... ہواؤں کے کوئی آثار ... اس دن ... مقام کے ماہر ...

ہیمنگ وے کے گھر Finca Vigia کے چاروں طرف لوگوں کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ ٹیلی فون پر بات چیت کرتے ہوئے دو گھنٹے پیشتر ہی اسٹاک ہوم سے سرکاری طور پر اطلاع ملی تھی کہ ہیمنگ وے نے نوبل پرائز جیت لیا ہے۔ کئی دن پہلے سے پیشینگوئیاں ہو رہی تھیں اور پریس بالکل تیار اور متوجہ تھا۔

اب وہ ٹیلی فون پر تھا۔ ریسیور پر ... کی آوازوں کے ساتھ ملی جلی ہوئی آواز آتی۔ اس نے آواز پر قابو رکھتے ہوئے دھیمے اور صاف لہجے میں مناسب جواب دیا۔ لہجہ ... معلوم ہوتا تھا۔ آواز میں جوش محسوس ہوتا تھا۔ لوگوں کے شور و غل اور بات چیت کی ہلکی ہلکی آوازیں ... اس کے پیچھے سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں لیکن وہ متحمل اور غیر متوجہ تھا اور بات چیت کے لئے بالکل تیار نظر آتا تھا۔

ہیمنگ وے کا نظریۂ ادب کیا ہے؟ وہ مصنف سے کیا چاہتا ہے؟ تنقید کے بارے میں اس کے تاثرات کیا ہیں؟ ان سب کے بارے میں بریٹ نے اس کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ مصنف کے بارے میں ہیمنگ وے کہتا ہے۔

"لکھنے والے کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ جہاں تک اس سے ممکن ہو سچائی کے ساتھ لکھے۔ افسانہ نگار اپنی معلومات کو اپنی قوتِ ایجاد کے ذریعہ افسانہ کی صورت دیتا ہے۔ تو اس لئے ہمیں ان تخلیقات کو فوٹوگراف یا حقیقت پسند ... سمجھنا ... مصنف کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اپنی معلومات کو ترتیب دے کر ایک ایسی چیز تیار کرے جو الفاظ کا جامہ پہننے کے بعد ذہن کے لئے اس کے اپنے تجربات کا جزو بن جائے۔"

سچائی کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو، کی شرط لگا کر ہیمنگ وے اپنے مخصوص تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ تصور خود حقیقت پسندی سے مختلف ہے۔ اس طرح اس کا نظریہ کہ وہ حقیقت پسندی اور محض حقیقت پسندی Absolute Realism کے درمیان کی ایک چیز بن جاتا ہے۔ ایک طرف وہ حقیقت پر پردہ بھی نہیں ڈالتا اور دوسری طرف سچائی، زندگی اور تجربہ جیسے الفاظ سے مخصوص خیال کو مد نظر رکھنا چاہتا ہے۔ تنقید کے سلسلے میں اس کے ریمارک بریٹ نے اس طرح نقل کئے ہیں۔

"میں نے تنقید سے بہت کچھ سیکھا ہے مگر جس وقت تنقید سادہ طرز کی تھی۔ اور جب مجھے تنقید نے ... اور ... جانے لیا لیکن ... تو ... شروع کیا میں نے اس سے

کچھ نہیں سیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ نقاد ادب کی تخلیق کے اسرار بہت ہی کم جانتے ہیں۔"

خطابت سے ہیمنگ وے کو کوئی لگاؤ نہیں ہے وہ خطابت کو صحیح ادبی ذوق کے نشو و ارتقاء میں ایک بھاری رکاوٹ سمجھتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

"سچ پوچھئے تو ماٹیگر فون ادب اور فن کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ آدمی کو اپنے خیالات و نظریات لکھے ہوئے لفظوں میں ادا کرنے چاہئیں بجائے اس کے کہ وہ تقریروں اور مباحثوں کے ذریعہ انھیں ادا کرے۔"

بریٹ نے ہیمنگ وے کو یاد دلایا کہ اٹلی کے ایک مصنف Ignazio Silone سے ایک بار یہ پوچھا گیا کہ تاریخ کا سب سے اہم دن کون سا ہے تو اس نے جواب دیا ۲۵ دسمبر سنہ صفر۔

ہیمنگ وے نے جواب میں کہا "میرے نزدیک کوئی تاریخ اہم نہیں۔ نجوم اور اس قسم کے دوسرے علوم پر میرا عقیدہ کبھی نہیں رہا۔ میں نہیں جانتا کہ 'Man' (اعلی انسان) سے کیا مطلب ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ 'man' (معمولی آدمی) کیا ہے۔ میں نے جو کچھ سیکھا ہے ان معمولی آدمیوں، مردوں اور عورتوں اور کچھ جانوروں کے متعلق سیکھا ہے۔"

ہیمنگ وے آج کل کیا لکھ رہا ہے؟ اس سوال کے جواب میں اس نے تیقن اور ضبط کے ساتھ کہا۔

"افریقہ کے بارے میں میں نے تین افسانے لکھنے شروع کئے تھے جن کا مجموعہ Charles Scribners کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ سات غیر مطبوعہ افسانے موجود ہیں پہلا افسانہ میں نے لکھ کر جب دوسرا شروع کیا تو وہ ناول کی صورت اختیار کرنے لگا۔ آج کل میں اسی کہانی پر لکھ رہا ہوں۔"

آخر میں اس نے نوبل پرائز کے بارے میں اپنے جو تاثرات ظاہر کئے وہ بھی قابل مطالعہ ہیں۔ بریٹ ہیمنگ وے کے الفاظ اس طرح پیش کرتا ہے۔

"بہ حیثیت ایک نوبل پرائز حاصل کرنے والے کے، میں سوائے اس افسوس کے اور کیا ظاہر کروں کہ نہ تو مارک ٹوین Mark Twain کو کبھی انعام دیا گیا اور ہنری جیمس Henry James کو میں صرف اپنے ہی ملک کے دو آدمیوں کی بات کہتا ہوں۔ ان کے علاوہ اور بھی چوٹی کے مصنفین ہیں جنھوں نے کوئی انعام نہیں پایا۔"

"آج مجھے خوشی ہوتی اور میں اور زیادہ خوش ہوتا اگر Isac Dineson یا Bernard Berenson جیسے اچھے لکھنے والے انعام پاتے جنھوں نے پینٹنگ پر اس قدر عمدگی اور جامعیت سے لکھا ہے اور اسی میں عمر گزار دی ہے۔ اور میرے لئے سب سے زیادہ خوشی کا موقع ہوتا اگر مجھے یہ خبر ملتی کہ "کارل سینڈ برگ Carl Sandburg کو دیا گیا ہے۔"

"اب جب کہ میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں اور سویڈش اکاڈمی کے فیصلہ کا اعزاز و احترام بھی مجھ پر لازم ہے۔ مجھے اس طرح کی کوئی بات نہیں کہنی چاہئے۔ جسے کوئی اعزاز دیا جائے اسے خوش دلی اور احترام کے ساتھ اعزاز کو قبول کر لینا چاہئے۔"

" بریٹ نے ہیمنگ وے پر ایک مختصر سا تبصرہ بھی کیا ہے۔ جو افادیت سے خالی نہیں۔

ہیمنگ وے کی عمر چھپن برس ہے۔ شروع ہی سے جبکہ سنہ ۱۹۲۴ء میں اس نے افسانوں کا ایک مجموعہ "ہمارے وقت میں" شائع کیا تھا۔ یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ امریکی ادب اور زندگی میں ایک امتیازی اور منفرد فنکار داخل ہوا ہے اور دو سال بیشتر تو اس کی فنی تربیت و تنظیم کی صلاحیتیں معراج پر پہونچ گئیں۔ جب اس نے اپنا پہلا ناول "The Sun also rises" شائع کیا لوگوں کو اس کی فنی صلاحیتوں پر ہر سوال معقولیت سے خالی نظر آنے لگا۔

وہ سب سے زیادہ با اثر اور صاحب فکر ادیب شمار کیا جانے لگا۔ اس نے لفیسر کبھی تقریر اور مباحثہ کا سہارا لئے ایسی چیزوں کو چھیڑا جنھیں بقول Faulkner قلب کی ابدی صداقتیں کہا جا سکتا ہے۔ عقل اور وجدان، حریت اور محبت، حس اور اخلاقی قیود، عمل اور اخلاق سب واضح صورت میں ہیمنگ وے کی زیر رد اور منقیحی مگر فطری زبان میں ڈھل ڈھل کر سامنے آنے لگے۔

جو کچھ اس نے لکھا وہ اس کے پڑھنے والوں کے تجربات کا ایک جزو بن گیا۔ ہیمنگ وے نے اپنی تمام عمر حسن خیر کے حصول کی کوشش میں گذار دی وہ ایک مابعد الطبیعیاتی مقصد سے بڑھکر دوسرا کوئی جمالیاتی مقصد نہیں تھا۔ اس کے بہر واضح اور بہر رو دعظ میں ان بنیادی رجحانات کی جھلک ظاہر ہونے لگی جن کا وہ تمام عمر حامل رہا تھا۔ اس طرح لوگوں نے اس سے جو کچھ حاصل کیا۔ وہ محض ادب پارے ہی نہیں تھے ان میں اس کے وجود کی جامعیت بھی تھی جسے ہیمنگ وے نے کبھی نمائشی طریقے سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بڑی حد تک بے پیاری سے کام لیا لیکن پھر بھی۔ یہ چیز موجود تھی اور ظاہر ہو کر رہی تھی۔ یہ ایک عظیم تجربہ تھا جو ہیمنگ وے نے کیا۔ زندگی کے اسرار و رموز کی کھوج میں ایک سنجیدہ شخص اپنی تمام سنجیدہ کوششیں صرف کرنے لگا۔ اور بالآخر مختلف لوگوں مختلف شخصیتوں کے مطالعہ کی روشنی اسے منزل کی طرف کشاں کشاں لے گئی۔ سلزآگ سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔ Stendhal اور Henry James کی ذہنی بلندیاں اس کے تجربوں کے لئے شمع راہ بن گئیں۔

یہاں کہا جا سکتا ہے کہ ہیمنگ وے کی حیثیت ایک میڈیم medium کی سی نظر آتی ہے۔ کیا وہ، بلزاک، استینڈھال، اور ہنری جیمس ہی کو دہرا رہا ہے؟ اس کی کوئی اپنی حیثیت نہیں ہے؟ بریٹ اس پہلو سے ہیمنگ وے کی پوزیشن کو مبنی بر صداقت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ایک سنجیدہ قسم کا مصنف ہرکیف ایک میڈیم کا کام کرتا ہے۔ ہیمنگ وے خود ایک میڈیم ہے۔ ایسا مصنف ہر اس چیز کو جو واقع ہوتی ہے۔ جو کار آمد ہوتی ہے جس کا وہ تجربہ کرتا ہے۔ دیکھتا ہے۔ سونگھتا ہے۔ سنتا ہے۔ نوٹ کرتا ہے —— اُسے میڈیم کے ذریعہ ایک حقیقی شکل دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر چیخوف کے ساتھ جو کچھ واقعات پیش آتے رہے اس کی زندگی میں داخل ہوتے ہی افسانے بنتے گئے۔ Yeats کے یہاں یہی چیزیں نظموں کا جامہ پہنتی رہیں۔ Gide نے ان کو اخباری مضامین کی شکل دی۔ گویا ان کی اپنی کوئی خاص شکل نہیں ہوتی۔ جیسا سانچہ ملتا ہے اسی میں ڈھل جاتی ہیں۔

ہیمنگ وے ایک سنجیدہ مصنف اور آرٹسٹ ہے۔ اس کا فن حقیقی توانائی کا ایک عمل ہے۔ اس کے یہاں عمل نام ہے بے لچک ایمان داری اور خودی کے بے لاگ اظہار کا۔ اور یہی چیز آرٹسٹ کو بھاتی ہے۔ ہیمنگ وے کے آرٹ میں زندگی کی اسی کشاکش کا اظہار ملتا ہے مگر اس کا آرٹ لفاظی اور ابہام سے پاک ہے۔ وہ مختصر لفظوں میں زندگی کی ایک واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ اس وصف کو اس نے شروع سے نبھایا ہے۔

یقیناً ہر کاری طور سے "اتنی تاخیر کے بعد اس کی قدر کیوں پہچانی گئی؟"

"ان عوامل سے ہٹ کر حسن پرتھا اس سے کام لیکر ہی رائے زنی کی جاسکتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نسل کی کچھ خاص ضرورتیں ہوتی ہیں۔ وہ اسی چیز کو اپناتی ہے جو اس کی ضرورت اور اس کے مذاق کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ تنقید کا فرض ہے کہ ہر نسل کی ضرورت کی نشاندہی اور ان میں امتیاز کرے۔

ہم سے پہلے کے لوگوں کی ضرورتیں ہم سے مختلف تھیں۔ اُس وقت کوئی سوچ بھی سکتا ہے یہ کہ پڑھنے کے بعد اس میں بیلوں کی دوڑ اور خونریزی اور Brett کے کردار میں ظلم کے سوا کچھ پاتا ہی نہیں تھا۔ ہیمنگ وے کی ایک اور تصنیف 'Death in the afternoon' میں لوگوں کو محض تشدد کی مدح سرائی ہی نظر آتی تھی۔ غرض ہر کس بقدر ہمت اوست' والا معاملہ رہا۔

اب ہم ہیمنگ وے کو پہلے کی بہ نسبت زیادہ توازن کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ ہماری ضرورتیں اور ہماری پسند کے معیار جدا ہیں۔ "سورج بھی نکلتا ہے" کے ماہی گیری کے مناظر میں ہمیں اب ماہیوں Pasternak کی خوبصورتی کا احساس ہو رہا ہے۔ امریکی اور ہسپانوی لوگوں کے دلچسپ تعلقات ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ Brett کا اخلاقی تعلق ہمیں سوچ بچار پر آمادہ کر رہا ہے۔ دوسری کتاب "دوپہر بعد موت" میں اب لوگوں کو جرأت اور بہادری کی تعریف مل رہی ہے۔

بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کی نظر میں بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہماری نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ مگر ایک دن پس منظر پیش میں تبدیل ہو کر رہتا ہے۔ آج ہماری نظر میں ہیمنگ وے کی دنیا انسانیت اور رحمدلی کی دنیا ہے جو کل تک یہی موت اور تشدد کی کشاکش سے بھرپور تھی۔

اس فرق کے اثرات بہت دور رس ہوتے ہیں۔ فیصلہ کر دینے والے بعض لمحاتی تاثرات کے تحت فیصلہ کر دیتے جاتے ہیں۔ اور اس رویہ کی بدولت ان کے فیصلے خام کاری پر مبنی ہوتے ہیں، یہ وقتی خام کاری افسوسناک ہی جانے یا نہ کہی جائے مگر اس کے بھیانک نتائج بعض لوگوں کی زندگی بھر بھگتنے پڑتے ہیں، جوائس Joyce نوبل پرائز سے محروم ہی رہا اور Yeats کو انعام مل گیا۔

ہرکیف ہیمنگ وے اپنی اس مختصر زندگی میں ہنسی خوشی ایک مدت تک لکھتا رہا ہے۔ اس نے اس عمر میں بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ برسوں ایسا ہوتا رہا کہ اس سے کم درجہ اور کم اثر رکھنے والے مصنفوں کو نوبل پرائز ملتا رہا۔ لیکن اس کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ خوش رہا، اور اب بھی اسے کسی سے شکایت نہیں ہے۔"

جادہ پیما بےخودی میں کاروانِ شوق ہے
کیا عجب مل جائے اُس کو اپنی منزل کا سراغ

چشمِ انساں سے چھُٹے خون کا بہنا اور سینۂ گیتی کا داغ داغ نظر آنا یہ تو رہتا ہی اور ہر مکتبۂ فکر کا فن کار کہہ سکتا ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ ان تلخ حقیقتوں کے پیچھے جو اسباب کارفرما ہیں اُن کی تہوں کو شاعر نے کہاں تک ٹٹولا ہے اور کس نتائج پر پہنچا ہے اور پھر سب سے اہم چیز یہ کہ ان نتائج کی روشنی میں کس تصورِ حیات کی نشاندہی کی ہے۔ نظم کا کوئی شعر بھی کسی ٹھوس نظریۂ حیات کی طرف قاری کی رہنمائی نہیں کرتا۔

بلاشبہ شاعری اور دوسرے فنون میں فرق ہے۔ اس میں شاعر کو اپنے جذبات و احساسات کو وسیلہ medium بنانا پڑتا ہے اور یہ بھی امر مسلّمہ ہے کہ پیرایۂ بیان suggestive ہونا چاہئے لیکن اس کا یہ مفہوم تو ہرگز نہیں کہ قاری کو زمین اور آسمان کے درمیان معلّق چھوڑ دیا جائے یا اسے ایک لق و دق میدان میں بالکل تنہا چھوڑ کر یہ کہہ دیا جائے کہ جس طرف چاہو چل پڑو۔ اس کے برعکس عظیم شعری تخلیق میں فکر انگیز اشاروں کے ذریعہ ایسے گہرے نقوش ثبت کر دیے جاتے ہیں جن سے قاری کا تخیل بےراہ روی نہ اختیار کر سکے۔ بلکہ اعلیٰ درجے کے فن کار کی تو یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ خود قاری کے فکری دھاروں کو توڑ کر اپنے سیلاب میں بہائے جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری اس کے ثبوت میں ایک اچھی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جب ہم نظم کے آخری شعر کو پڑھتے ہیں تو صاف صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خود شاعر کی فکر و نظر کے پیچھے کوئی زندہ اور متحرک نظامِ فکر نہیں ؎

جادہ پیما بےخودی میں کاروانِ شوق ہے
کیا عجب مل جائے اُس کو اپنی منزل کا سراغ

وہ خود ناآشنائے منزل ہے اور ابھی تو بےخودی کے ہاتھوں میں اُس کی زمامِ شوق ہے دیکھیے منزل کا سراغ ملتا بھی ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی شعری تخلیق جس میں خود زندگی کا کوئی متعین اور روشن تصور موجود نہ ہو اور جس میں کاروانِ شوق بجائے شعور و آگہی کے بےخودی کے سہارے آگے بڑھ رہا ہو وہ بھلا قاری کو کیا دے سکتی ہے اور کیا suggest کر سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری میں جب تک تناسب اور اقدار کے ساتھ ساتھ نظریاتی شعور کا بھرپور دھارا موجود نہ ہو اُس وقت تک نہ تو وہ جدید انسانی تخیل کو اسیر کر سکتی ہے اور نہ فن اور مقصد کے اعلیٰ تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اس نظم کے دو ہی غالب رجحانات ہیں۔ ایک تو مجہول رومانیت کا رجحان ہے جو زندگی کے حقائق سے فرار اختیار کر کے نغمے پر مائل کرتا ہے۔ پہلا بند شروع سے آخر تک اسی فراری ذہنیت کا مظہر ہے۔ اس میں جن خیالات کو نظم کیا گیا ہے اُس کی پوری تفصیل نظموں کے ابتدائی حصوں میں بیتی کر دی گئی ہے بلکہ بعض اشعار میں تو ایسا مواد پیش کیا گیا ہے جو نہ صرف مقصدی نقطۂ نگاہ سے غیر ضروری ہے بلکہ غیر صحت مند اور عامیانہ بھی ہے۔ مثلاً یہ اشعار ؎

یہ تجلّی، یہ تبسّم، یہ ترنّم، یہ فضا،
آج کی شب ہے روا ہر لغزشِ گامِ جنوں
تیرے آئینے میں رقصاں ہے جمالِ روئے یار
شوق کہتا ہے کہ جھک کر تیرے عارض چوم لوں

اور دوسرا رجحان شکست خوردگی اور قنوطیت کا ہے جو بظاہر الگ نظر آتا ہے مگر اسی مجہول رومانیت کی پیداوار ہے۔ یعنی دوسرا بند ایسے جذبات و احساسات میں ڈوبا ہوا ہے جو رومان کو بجائے حرارت اور نئی اُمنگ دینے کے اسے اور بھی کج بحث اور مضمحل بنا دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

کی بہت سعیِ علاجِ گردشِ دوراں مگر
ایک حالت پر رہا قائم مزاجِ روزگار
دیکھئے برقِ حوادث سے ہے کب ملتی اماں
ہے ابھی تک تو نشیمن کی فضا سازگار
جب بھری صیاد و گلچیں پاسباں کے بھیس میں
پھر چمن میں آئے کیونکر کاروانِ نو بہار

ان اشعار میں کس قدر مایوسیت کا عنصر پایا جاتا ہے تو اس میں رجائیت کو کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ جد و جہد اور تگ و دو کے [illegible] دیے گئے کھلائے گئے ہیں کائنات بھی بجھی بجھی سی اور تاریک نظر آنے لگتی ہے اور بھلا [illegible]۔ یہی جب شاعر چشمِ انساں میں ٹوٹے خوں کی یاد دلاتا ہے اور زندگی کے سوگوار دیوانوں کو دیے خونِ دل سے سیراب کرنے کا عزم رکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے پاؤں جکڑ دیے گئے ہوں اسی تھکن اور رُوح کی گہرائیوں میں ایسا جمود و اضمحلال محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تحریک نہیں پیدا ہوتی۔ یہ بند پوری نظم میں ایک بےجوڑ پیوند بن کر رہ گیا ہے۔ بلکہ آخری شعر نے تو [illegible] کی رہی سہی توانائی بھی چھین لی ہے۔ انساں کا سفر اور ایسی منزل۔ جب بےخودی ہی راہبر ٹھہرے تو منزل کا اندازہ فقط [illegible] ہوگا [illegible] تو مرحلے کی نوعیت معلوم اور نہ سمت متعین ہو!

اس مختصر سے تبصرے کے بعد [illegible] یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کو فکری حیثیت سے جس [illegible] ناتر کی شدت کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ [illegible] میں [illegible] تھا اُس میں وہ بری طرح ناکام ہی نہیں [illegible] بلکہ [illegible] غیر [illegible] انتخاب نے اِس نظم کو غیر مقصدی تاثرات کا حامل بنا دیا ہے۔ [illegible] ساحر [illegible]

کی نظم جاگیر دیکھی ہے۔ وہ جانتے ہوں گے کہ شاعر کا مقصد جاگیردارانہ نظام کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنا تھا مگر موضوع اور مواد کے غیر متناسب اور غیر محتاط treatment کی وجہ سے اُس کی نظم کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا اور بجائے نفرت کے جاگیردارانہ نظام سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ "ہم اردو" ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں بظاہر شاعر رومان سے انقلاب کی طرف قدم اٹھانا چاہتا ہے۔ اور آسمان سے زمین پر اترنے کی کوشش کرتا ہے لیکن موضوع کے انتخاب اور مواد کے اجزائے ترکیبی میں توازن اور تناسب کے فقدان کی وجہ سے اُس کی نظم کا بنیادی مقصد ہی مجروح ہو کر رہ گیا۔ سستی رومانیت اور گہری قنوطیت غالب آ گئی۔

یہ کمزوری صرف ایک یا دو شاعروں تک محدود نہیں ہے بلکہ عام طور پر نظم گو شعراء اس طرح کی فکری ناہمواریوں کے شکار رہیں۔ طوالت کے خوف سے میں ان مسائل کے سلسلے میں اپنے دو معاصرین کے چند اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ افتخار اعظمی اور دوسرے تعمیر پسند فن کاروں کو اس طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

" افسانہ اور حقیقت نگاری" میں ایک مقام پر راقم الحروف نے لکھا ہے کہ

" کائنات کی ہر چیز اپنی معنی آفرینی اور مقصدی وجود کے باوجود یکساں طور پر اہمیت نہیں رکھتی پانی ریت اور سورج کی روشنی سے مقابلے میں سونا چاندی اور جواہرات کی کس قدر اہمیت ہو سکتی ہے اُس کا اندازہ ایک معمولی ذہن بھی لگا سکتا ہے اور یہی حال کائنات کی ہر چیز اور زندگی کے تمام مظاہر کا ہے۔ اسی طرح زندگی کا کوئی واقعہ تلخ اور حقیقی ہونے کے باوجود معیاری اہمیت پر برابر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح اندھے اور آنکھیں رکھنے والے برابر نہیں ہو سکتے اور تاریکی و روشنی مساوی حیثیت نہیں رکھتیں ٹھیک اسی طرح زندگی کا کوئی واقعہ اور زمین کی کوئی چیز بھی اپنی مقصدی تخلیق کے باوجود یکساں اہمیت اور افادیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔ ہر پیرائے دائرۂ عمل میں مختلف اہمیت و افادیت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور اسی کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے فن کار کو اس چیز یا اُس واقعہ کو پوری زندگی سے ملا کر دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ اگر اس کی نگاہ پوری زندگی کے مقصدی وجود اور اس کے عوامل پر نہیں ہے تو اس کا قوی امکان ہے کہ جس قدر دیانت داری اور وسیع النظری مطلوب ہے وہ پہلے سے اس کی تخلیق میں ناپید ہو کر رہ جائے اور دوسرا ضروری پہلو جو فن کار کے تخلیقی عمل میں بہت سے زیادہ پیش نظر رہنا چاہئے وہ یہ کہ جس چیز یا زندگی کے جس واقعہ کو وہ ایک خاص صنف ادب میں جگہ دینا چاہتا ہے خود اُس کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ کائنات میں اُس کی اہمیت اور افادیت کتنی ہے؟ اور پورے نظام زندگی سے اُس کا کیا اور کتنا رشتہ ہے۔"

ایک دوسرا مقالہ جدید اردو غزل میں تعمیری رجحانات بھی ہے۔ اُس کا ایک اہم اقتباس جو نفس موضوع سے گہرا تعلق رکھتا ہے اُسے بھی پیش نظر رکھئے۔

" اگر ایک آرٹسٹ خدا پرست ہے، نظام حیات کو تمام انسانی دکھوں کا مداوا سمجھتا ہے، اگر اُسے اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ موجودہ سماجی نظام کی مادی و اخلاقی پستیوں کا سبب لادینی جمہوریت ہے تو پھر اُسے ایک واضح فیصلہ کرنا ہوگا۔ اور ادب میں کیوں اور کیسے کا صاف صاف جواب دینا پڑے گا اور اُسے یہ بھی محسوس کرنا ہوگا کہ حقیقت کے ان مظاہر کے پیچھے خود خالق کائنات کے تخلیقی مقاصد کیا ہیں اور وہ شعوری طور پر اُن سے کہاں تک اور کس حد تک اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان عظیم مقاصد سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ادیب یا آرٹسٹ کو موضوع اور مواد (Subject matter) کے انتخاب میں غیر معمولی احتیاط اور حکمت سے کام لینا ہوگا۔ نہ تو ہر موضوع ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔ اور نہ ہر موضوع کے ابھرنے میں فن کار کی تمام تخلیقی صلاحیتیں اپنی تابانیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آ سکتی ہیں۔ ادیب ہر چیز اور ہر انسان کے متعلق نہیں لکھ سکتا۔ اُسے اپنے موضوع اور مواد کے انتخاب میں انتخابی طریقہ کار کو اپنانا ہی پڑتا ہے۔ ایک کتاب اس لئے نہیں لکھی جاتی کہ ادیب کو اُس کے لکھنے کا طریقہ معلوم ہے بلکہ اس لئے کہ وہ کتاب خود ادیب کے دماغ سے نکلنے کے لئے بے چین ہے۔ ایسے خارجی و داخلی محسوسات سے ہو کر اُسے گذرنا پڑتا ہے کہ وہ کچھ لکھنے کے لئے مضطرب ہے۔ فی الحقیقت یہی جذبۂ تخلیق creative impulse ایک ادیب یا آرٹسٹ کے فن کی جان ہے۔ اور یہ اسی وقت نمایاں ہو سکتا ہے جب احساس میں شدت و گرمی ہو اور مقصد کی وسعت و ہمہ گیری اُس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو۔"

ابو خالد۔ ایم اے

جہانِ صوت و صدا کو بے صدا بنانے کی جدوجہد

مشہور مرد دانا لقمان نے اپنے جگر بند کو جہاں اور نصیحتیں کیں جن کی قدر و قیمت یہ ہے کہ قرآن کریم کے صفحات میں ان کو جگہ ملی وہاں ایک یہ بھی تھی کہ اپنی آواز کو پست کرو، سب سے ناگوار آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔" شور و غل سے اظہار بیزاری کا اس سے بلیغ طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ گدھوں سے آپ کو خواہ کتنی ہی ہمدردی ہو اور ہمدردی کے وجود بھی چاہئے آپ کے نزدیک جس قدر وزنی اور مبنی بر معقولیت ہوں لیکن گدھے کی آواز آپ کے اعصاب اور سماعت پر کوئی خوش گوار اثر چھوڑ جاتی ہے اس سے یقیناً آپ کو انکار ہوگا۔

چیخ و پکار کا تہذیب و اخلاق کے نقطہ نظر سے معیوب ہونا اپنی جگہ پر اس کا اثر انسانی صحت پر خراب پڑتا ہے یہ بات بھی اب تحقیق و تجربے سے ثابت ہو چکی ہے اور کون جانے دانش مند لقمان نے بیٹے کو سلیقہ مندی کا سبق دیتے ہیں اس پہلو کو بھی نگاہ میں رکھا ہو۔ علامہ اقبال نے فرمایا ؎

جہانِ صوت و صدا میں سما نہیں سکتی
لطیفۂ ازلی ہے فغانِ چنگ و رباب

جہانِ صوت و صدا کے سائنس داں اب اس فکر میں ہیں کہ اس لطیفۂ ازلی کو مقید کردیں کیونکہ ان کے اعصاب اس کے حریف نہیں ہو پاتے، ان کا خیال ہے کہ اس جہان صوت و صدا کو اگر عالم صمت و سکوت میں نہ تبدیل کیا گیا تو گوش لذت کوش و حق نیوش دونوں کام کے نہ رہ جائیں گے اور اعصاب کا پیہم تشنج اور ضربات قلب کا متواتر اختلال انسان کو بتدریج اس دردناک انجام سے دوچار کر دے گا جو ایک مینڈک کا ہوتا ہے اگر اس کو پانی میں ایسے جوش دیا جائے کہ درجۂ حرارت آہستہ آہستہ بڑھ کر انتہائی نقطہ پر پہنچے۔

جان سڈنی John Sydney نے اپنے ایک مقالے کی ابتدا اس سوال سے کرتے ہوئے کہ کیا مستقبل کا انسان شور ہنگامے کی دنیا کے باعث بہرا ہو جائے گا؟ شور و غل کے مضر اثرات اور ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر و عزائم و انکشافات پر بہت دلچسپ مفید اور سائنٹفک معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ذیل کی سطروں میں اس کے مقالے کا آزاد ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

مشہور سائنس داں اور موجد ٹامس ایڈیسن Thomas Edison نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک زمانہ آئے گا جب انسان کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہے گا کہ اپنے ابنائے جنس سے مصنوعی برقی تاروں کے ذریعہ ربط پیدا کرے۔ اس دعویٰ کو ایک حد تک مبالغہ آمیز رنگ آمیزی پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن عہد حاضر کے سائنس داں آنجہانی ایڈیسن سے اس امر میں یقیناً متفق ہوں گے کہ گذشتہ زمانے کے مقابلے میں آج ہم کہیں زیادہ شور و ہنگامے کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ کہ شور و غل صحت اور کارکردگی دونوں کے لئے مضر ہے۔

اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ شور و غل کی زیادتی سماعت کو نقصان پہونچاتی ہے۔ ہنگامی اور وقفات کے ساتھ متواتر اور پیہم شور و غل سماعتی عضلات پر بے شمار کاری ضربیں لگاتا ہے اور کان کی نازک مشینری ان حملوں سے بالکل تباہ نہ ہو تو مجروح ضرور ہی ہو جاتی ہے۔

جس طرح ہم مسافت اور طول و عرض کو انچ اور فٹ کے پیمانوں سے ناپتے ہیں اسی طرح سائنس دانوں نے شور و غل کی پیمائش کے لئے ایک مخصوص پیمانہ وضع کر لیا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام Decebles ہے۔ آواز کی اکائی کو اسی نام سے پکارتے ہیں چنانچہ ایک جیٹ طیارہ قریب واقعے پر ۱۵۰ صوتی اکائیاں Decebles بناتا ہے۔ اسی طرح پر Propeller سے چلنے والے طیارے سے اور ایک ایکسپریس ٹرین سے بالترتیب ۱۱۵ اور ۱۹۰ اکائی شور و غل وجود پذیر ہوتا ہے۔

دوسری جانب پتوں کی سرسراہٹ یا سرگوشی سے صرف ۱۰ Decebles شور و غل پیدا ہوتا ہے۔

۵۰ یونٹ یا اس سے زیادہ شور و غل اگر مسلسل قائم رہے تو اس کا اثر ہماری کارکردگی پر بھی پڑتا ہے اور اس سے نظام اعصاب میں بھی خلل واقع ہوتا ہے۔

اس معاملے کا ہماری صحت و سلامتی سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ بات جان لینا کافی ہوگا کہ ایک چوڑی سڑک کا شور مقابلتہً ۱۵ کائی زیادہ

ہوا کرتا ہے۔ یہی حال ایک دفتر کا ہے جہاں جمع و تفریق Adding Machines و ٹائپ رائٹر مسلسل کھٹکھٹاتے رہتے ہوں۔ غالباً آپ اس کا یہ جواب دیں گے کہ اس شور کے تو ہم عادی ہو چکے ہیں۔ ہمیں اس کا خیال تک نہیں ہوتا۔ زاویہ راہ عامہ Street Corner اور چونتیسویں سڑک Thirty fourth Street میں اتنا شور ہوتا ہے کہ اس سے ایک اوسط صحت کا آدمی اس مدت کے لئے جب وہ وہاں ہو بہرا ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں پر تین تہرا ہیں، تین ٹرام کی پٹریاں اور اوپر سے گزرنے والی دوہری ریلوے لائن ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔

چند سال قبل سائنس دانوں نے تجربہ کیا۔ ایک ٹیکسی موٹر گاڑی Taxi Car کے گزرنے سے جتنا شور و غل پیدا ہوا اس سے ایک سوتے ہوئے آدمی کے خون کا دباؤ بڑھ گیا۔ اسی طرح محض آہستہ پاس سے گزرنے کی آواز سے اس کے اعصاب میں اتنی بڑی کشیدگی Tension پیدا ہو گئی جتنی عام طور پر حالت بیداری میں ہوا کرتی ہے۔

شور و غل کا جو اثر ہماری صحت پر پڑتا ہے اس کی نوعیت کا اندازہ کرنے کے لئے یوں سمجھئے کہ ایک بنڈل کو زندہ ابالا جا سکتا ہے اگر پانی کا درجہ حرارت بتدریج ابلنے کے نقطے تک پہونچایا جائے۔ درحقیقت جتنی تطبیق Secondary Adaptation [illegible] احساس کے بجھ جانے کا سوال ہے [illegible] ہمارے [illegible] اعصاب [illegible] Sensitive Nerve Terminals اسی طرح بے حس ہو جاتے ہیں [illegible] ہم [illegible] سمجھتے ہیں کہ شور کا ہمارے اوپر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا [illegible] نقصان جسم کو پہونچتا رہتا ہے۔

ایک ایسے دفتر میں جہاں شور و غل [illegible] "Key" پر [illegible] Energy [illegible] کارکردگی میں ۱۵ فیصدی اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس سوال یہ ہے کہ شور کو کیسے [illegible] اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش شروع ہو گئی ہے۔ ٹرام اور [illegible] بے صدا بنا دیا گیا ہے یہاں تک کہ [illegible] والوں سے درخواست کی ہے [illegible]

ایک لاری یا ٹرک جس کے [illegible] ہوئی ہو اس لاری یا ٹرک سے [illegible] زیادہ شور [illegible] یہی وجہ ہے کہ [illegible] گاڑیوں کے [illegible] قطعاً ممنوع قرار دیدیا جائے۔

لندن کے کچھ ماہر گاربج ٹن Garbage Tin کا تجربہ کر رہے ہیں۔ یہ ٹن بے صدا ہوتے ہیں اور ان سے آواز نہیں پیدا ہوتی۔ وہاں کی دودھ بیچنے والی ایک کمپنی اپنے ملازمین کو ربڑ کے جوتے مہیا کرتی ہے اور بوتلوں کو ایسے ڈبوں میں رکھتی ہے جس میں اندر کی جانب ربڑ کی ایک موٹی تہہ ہوتی ہے تاکہ ہلنے سے کھڑکھڑاہٹ کی صدا نہ پیدا ہو۔

کارخانے کی سیٹی کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کیا ہی جا سکتا ہے۔ چند سال پہلے تو یہ سیٹیاں ٹھیک تھیں۔ ان کا کوئی بدل نہ تھا لیکن اب تو الارم کلاک بجلی کی گھڑی اور صبح کی ریڈیو کی نشست کا زمانہ ہے۔ اب لوگ کارخانے جا اور آ سکتے ہیں اور اس طرح کہ پورے مضافات کے اعصاب کی جان بھی نہ نکالنی پڑے۔ ریل کی سیٹیاں ان لوگوں کے اعصاب کے لئے ایک مستقل مصیبت ہیں جو بدقسمتی سے ریلوے لائن سے سماعت کی مسافت پر سکونت پذیر ہیں۔

سڑکوں کے تحت سے متعلق ساز و آہنگ کی مصیبت والی ڈرل Pneumatic drills بھی بہترین مسئلہ ہے۔ یہ ڈرل پر سکوت بنائی جا سکتی ہے لیکن اس کے خلاف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے مقدار کار میں بھی تخفیف واقع ہو۔ ممکن ہے یہ خیال درست ہو مگر ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہر نئے کام کی یوں ہی مخالفت ہوتی ہے۔ ان سکوت افزا "silencer" کے ساتھ جو ڈرل ہوں گی ان کی غیر مجروح انسانی قابلیت کار کے اعتبار سے بہر حال نسبتاً سستی ہوں گی۔

آئندہ کے مکانات بالکل بے صدا ہوں گے۔ یہ تبدیلی جاذب صدا دیوار اور [illegible] کھڑکیوں کے ذریعہ پیدا کی جا سکے گی جو اپنی ساخت کی مخصوص خصوصیات کے باعث شور و غل کو مفقود کر سکیں گی۔

شور و غل کے خلاف جنگ اور اس کے مضرات کا اعتراف کوئی جدید العہد اقدام نہیں۔ قدیم زمانے میں یونانیوں نے بھی اپنے شہروں میں شور و غل کو ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ SYBARIS جس کی بنیاد جنوبی اٹلی میں ۲۰۰۰ قبل مسیح میں پڑی تھی پورے شہر کو شور و علاقہ جات میں تقسیم کر دیا گیا تھا چنانچہ صنعتی کاروبار سے جو شور و غل ہوتا تھا بعض حلقوں میں اس کی بالکل ممانعت تھی۔ اس وقت بھی لوگوں میں یہ احساس موجود تھا کہ یا انسان شور و غل کو ختم کرے یا شور و غل انسان کو ختم کر دے گا۔

انسان شور و غل کو ختم کرتا ہے یا شور و غل انسان کو، یہ بات تو آئندہ معلوم ہو سکے گی لیکن اگر انسانی عزائم پایۂ تکمیل کو پہونچ گئے تو ساری دنیا ایک طویل و عریض شہر خموشاں بن جائیگی۔ [illegible] کے قبل قیامت انھیں بیدار کرنے والے تو ہوں گے کہ جیسے سو کر رہ جائیں گے۔ ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

وہ بھی عجیب حالت ہوگی جب اِس خطرے سے کہ مبادا اپنے یا مخاطب کے دل کی دھڑکنیں معمول سے زیادہ نہ بڑھ جائیں۔ ساری گفتگو سرگوشی کے انداز میں ہوا کرے گی۔ ساقی اپنے جلوے سے ایمان و آگہی کی دشمنی تو کامیاب ہو سکے گا۔ لیکن مطرب غریب بے بس اور لاچار ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے نغمے فردوسِ گوش نہ بن سکیں گے۔ جادۂ حیات میں ہر نیرہ پا ہی نہیں سست گام بھی خموش ہوگا ؎

کیسی یہ گئی بات جگر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

ذوالفقار علی خاں کے موٹر کی خموشی سے علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فلسفیانہ نتائج مرتب کئے معلوم نہیں ان کی نوعیت کیا ہوتی اگر ان کے سامنے یہ حادثہ پیش آتا کہ ریل گاڑی کے سیٹی چنگھاڑتے انجن اور سر پر شور قیامت برپا کرتے ہوئے لیارے بے صدا ہو کر پرچھائیوں کی طرح سامنے اور اُوپر سے گذر جاتے اور ساری دنیا خوابوں کی ایک بستی بن جاتی جہاں موت کا سا سکوت طاری ہوتا اور بولتے باتیں کرتے ہوئے انسانوں کے بجائے اس عالم آب و گِل پر سائے منڈلاتے ہوتے

اب کہاں انساں جنہیں انساں کہیں
چلتی پھرتی دیکھ لو پرچھائیاں

ناحق اور نا زیبا سننے والے کانوں سے بے شک بہتر بہرا ہونا۔ لیکن کچھ نہ سُن سکنے سے سُنائی دینا یقیناً اچھا۔ پھر یہ بات بھی کم غور و فکر کی محتاج نہیں کہ انسان کا بتدریج ایک مشینی وجود میں منتقل ہو جانا خود انسانیت کے نقطۂ نظر سے کس حد تک مناسب و مفید ہوگا۔ خدا کے عطا کردہ علم اور صلاحیت سے بیش از بیش فائدہ اٹھا اور تسخیرِ کائنات کے ذریعہ انسانی معاشرے کو اور خالقِ ارض و سما کی منشا کے مطابق اس کے بچتے ہوئے خزائن کو اس دنیا کے سنوارنے میں لگانا بجائے خود ایک سعی محمود ہے۔ لیکن اس زندگی کا تصور جس میں انسان اور انسان کے درمیان ایک جاندار ربط کے بجائے بجلی کے تاروں اور بیٹریوں کا جال ہو اور ہر انسان ایک چلتا پھرتا تار گھر بن جائے۔ جذبۂ حیرت کو تو ضرور بیدار کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک منفی اور یاس انگیز احساس بھی اس تخیل کے پیچھے سے اُبھرنے لگتا ہے۔ اور انسانیت کے مستقبل کے بارے میں کوئی طمانیت نہیں پیدا ہوتی۔

اقبال نے صنعتی انقلاب پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ؎

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

مجھے تو سائنس دانوں کی اس جادو جہد تک دو انسانیت ہی کو کچلتی اور روندتی نظر آتی ہے۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔

اصغر علی عابد

مغربی ادب کے تین دور (۳)

(قسط سوم)

آج کا "حقیقت پسند" ادیب رومانیت پسندی کے نام سے چڑتا ہے۔ اور اس کے ذکر سے جھنجھلا اٹھتا ہے۔ لیکن خود اپنی حقیقت پسندی میں وہ سب سے بڑا رومانی ہوتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حقیقت پسندی رومانیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل Perverted Romanticism ہے۔

دراصل رومانیت کی پیدائش کے وقت چاہے وہ کسی دور کی رومانیت ہو زندگی میں مادیت کی طرف جو میلان پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے بعد صرف یہ کہ اسی طرح برقرار رہا بلکہ کچھ اور بڑھ گیا۔ اس لئے حقیقت پسندی اور رومانیت میں سوائے لفظی الٹ پھیر کے کسی بنیادی فرق کا امکان قطعاً ناممکن ہے۔ بنیادی فرق اسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ انسانی سوسائٹی کی گاڑی مادیت کے علی الرغم کسی دوسرے اصول پر چل پڑتی اور سب جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔

اس نظری موازنہ کے بعد اب ذرا واقعات کی سرزمین پر بھی قدم رکھ کر دیکھیے کہ رومانیت اور حقیقت پسندی میں فرق و امتیاز کس حد تک ہے اور یگانگت و اتحاد کس حد تک یورپ میں اسٹیونسن R L Stevenson بری James Berrie اور کپلنگ Rudyard Kipling اسی دور کی پیداوار ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا لٹریچر خالصاً رومانی ہے۔ اسٹیونسن کی "Treasure Island" اور "Prince Otto" بری کی Sentimental Little Minister، Tommey اور Alice Sit by the fire اور اسی طرح کپلنگ کی نظمیں اور تصنیفات جن کا تعلق امپیریلزم اور نیشنلزم سے ہے سراسر رومانیت کی نمائندہ ہیں۔ پھر یہی حال فرانس، اٹلی، جرمنی، اور روس کے بڑے طبقے کا ہے۔ جو حقیقت پسندی کے اس دور میں بھی رومانیت پسند رہا۔ مزید براں وہ طبقہ جو خود کو حقیقت پسندوں میں شمار کرتا ہے۔ اور تاریخ کی زبان بھی اُسے حقیقت پسند ہی کہتی ہے۔ مثلاً فرانس کے فلابرٹ 'Gustave Flaubert' گان کورٹ برادران 'Gon Court Brothers' موپاسان Maupassant- زولا Emile Zola اور مشہور و معروف۔ اناطول فرانس۔ Anatole France جس کا اصلی نام Jacques Thibault تھا۔ طرزِ بیان۔ اسلوب۔ اور انداز نگارش کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ سب کے سب ایک ہی رُخ پر بہے جا رہے ہیں۔ اور وہ ہے رومانیت کی غیر شعوری منزلِ مقصود۔

انگلستان میں مری ڈتھ (Meredeth) اور ہارڈی (Hardy) اپنی کردار نگاری اور نفسیاتی تجزیے کے باوجود جیمس (William James) برنارڈ شا (George Bernard Shaw) اور ویلز (H G Wells) اپنی سائنٹیفک ناول نگاری۔ طنز۔ اور نفسیاتی کردار نگاری کے ساتھ ساتھ اعتبار سے، رومانیت ہی کے دلدادہ ہیں۔ بلکہ جیمس ولیم اور ہارڈی وغیرہ تو سراسر رومانی ہیں۔ البتہ شا اور ویلز کچھ بدلے ہوئے ہیں لیکن شا اپنے زورِ بیان۔ اشتراکیت پسندی اور بعض وقت بے جا تنقید اور غیر علمی مقصدیت کی بنا پر یکا جذباتی بن جاتا ہے۔ اور یہ رومانیت ہی کی ڈھلی ہوئی شکل ہے۔ اسی طرح ویلز 'Time machine' The First man in the Moon اور Modern Utopia میں ایک جذبات پرست رومانی نظر آتا ہے۔ اس کی مؤخر الذکر کتاب میں لفظ "Utopia" اس کی حقیقت پسندی پر ایک کھلا ہوا طنز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ دراصل ایک "خیالی حقیقت پسندی" "Utopian Realism"۔

ہی کے دلدادہ تھے۔

انگلستان کے علاوہ روس میں جو رفتہ رفتہ یورپ کے صفحہ پر نمایاں ہوتا جارہا تھا۔ ٹالسٹائی (Tolstoi) چیخوف (Chekov) اور گورکی (Gorky) کے نام آتے ہیں۔ لیکن سوائے ٹالسٹائی کے جس نے انسانی فطرت کی صحیح عکاسی کی بڑی حد تک کوشش کی اور ان کے عمل کے صحیح رخ کو متعین کرنے میں وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہوا دوسروں کو حقیقت پسند کہنا مضحکہ خیز ہے۔ اور سطحی اصلاح پسندی کے باعث جو تھوڑے عرصے بعد ہی بے فائدہ ثابت ہوئے۔ چیخوف اپنی تخشن نگاری۔ قنوطیت اور مجنونانہ کردار نگاری کے باعث "حقیقت" سے کوسوں دور جا پڑا۔ بہت سے لوگ چیخوف کی تحریر میں کھو کر اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اس کی سینکڑوں بے حقیقت باتوں کو حقیقت سے قریب سمجھنے لگتے ہیں لیکن یہ اُن کی نظر کا دھوکا ہے۔ چیخوف اپنے ادب میں "مقصدیت" کے اجزا ابھی رکھتا ہے۔ اور جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہو جائے کہ اس کی مقصدیت کہاں تک "حقیقت پسندی" کا ساتھ دے سکتی ہے۔ اس وقت تک اس کو "حقیقت پسند" کہنا بالکل بے جا بات ہے۔ یہی حال گورکی کا ہے۔ جو لوگ اس کی زندگی کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ گورکی جیسے شخص کو "حقیقت پسندی" سے دور کا وابستہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء تک اور اس کے بعد اپنی زندگی کے آخری دور میں کمیونسٹوں کا ساتھ دے کر ہر وقت اپنی جذباتیت کا علی الاعلان مظاہرہ کیا ہے۔ گورکی اگر کوئی "حقیقت" سے قریب تر کہہ سکتا ہے تو وہ صرف کمیونسٹوں کا فرقہ ہے۔ مگر اس دور کے ادیبوں میں چند اُمور مشترک ہیں۔

(۱) گھریلو۔ روایاتی۔ معاشرتی اور اخلاقی اُصولوں کے پس منظر میں انفرادی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ اور ان کی خامی یا خوبی کا ذکر اپنے رجحان اور طرزِ فکر کے مطابق۔

(۲) خاندانوں، گروہوں، اور مختلف طبقات کے معاشرتی مسائل پر غیر معمولی اصلاحی مطالبات کے تحت روشنی ڈالنا۔ مزدوروں عورتوں اور تقسیم دولت کے مسائل پر گفتگو کرنا۔

مگر ان دونوں اُمور میں "فضا" اور طرز (Style) کے اعتبار سے حقیقت پسندوں نے متضاد رجحانات کا اظہار کیا ہے۔

(۱) یعنی اگر معاشرتی اور تمدنی مسائل پر وہ ایک رجائیت پسند اور جرنلسٹ کی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہیں تو اسی قلم سے نفسیاتی مسائل کا ذکر کرتے وقت مکمل قنوطی (Pessimist) اور طنز نگار بن جاتے ہیں۔

(۲) حقیقت پسند بھی زمانۂ ماضی کے "قانون پسند" اہلِ قلم کی طرح اپنے مدعا کی وضاحت کے لئے کسی صحیح محاورے، صحیح لفظ اور صحیح توازن Proportion کے پابند رہنے کی "دردسری" مول لیتے ہیں۔

چنانچہ ان حالات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ کس حد تک حقیقت پسند تھے۔ اور کس حد تک جذباتی، رومانی یا ذہنی "قدامت پسند"!

ان واقعات کو دیکھ کر یہ نتائج بھی بآسانی نکالے جا سکتے ہیں۔ کہ رومانیت کی طرح حقیقت پسندی میں بنیادی طور پر (۱) مادیت اور خدا سے بغاوت کے جراثیم موجود ہیں۔ بلکہ یہ "غیر فطری اور باغیانہ جذبات" پر کی ہوئی ادبی ترقی کا دوسرا قدم ہے۔ (۲) انسان کے وہ جذبات و احساسات جو نظام کائنات پر وسیع النظری سے غور کرنے اور زندگی کی تعمیر کے لئے ایک ضابطہ پر چلنے میں ممد و معاون ہو سکتے تھے۔ وہ سب کے سب "واقعیت" کے ڈھونگ کے ساتھ گندہ اور غلیظ گلیوں کی چھان بین بدکردار عورتوں کی آبرو ریزی دفتروں کی مثلوں، کارخانوں کے دھوئیں اور کسان کے کھیتوں میں مٹی کے ڈھیلوں سے لطف اندوز ہونے میں ضائع ہو گئے۔ اور انسان ان سے کوئی صحیح خدمت نہ لے سکا۔

۳۔ جدیدیت

مادہ پرستانہ افکار جن کو ڈارون اور آگسٹ کومٹے کے "ایجابی نظریات" Positive Ideas کے سہارے آگے بڑھایا گیا تھا۔ اور نئے "استقرائی انداز تحقیق" Inductive method کی بیساکھیاں لگا کر کھڑا کیا گیا تھا۔ زندگی کی مستقل اور پائیدار بنیادوں کے لئے کچھ زیادہ مفید نہ تھے۔ البتہ مسخ شدہ عیسائیت کے "ردِ عمل" کی شکل میں ان کی حیثیت ضرور طاقتور دکھائی دیتی تھی لیکن جیسا کہ ایک ردِ عمل کی خصوصیت ہے۔ وہ حریف طاقتوں کے میدان سے ہٹتے ہی اپنی تمام "اصلیت" اور "خوبی" کھو بیٹھتا ہے۔ مذہب کے جاہلی افکار کے خلاف مادیت کے ردِ عمل نے بھی اس وقت اپنی تمام حرکت Action ترقی Progress معاشرتی ارتقاء Social Development اور تعمیری کاموں کی صلاحیت Constructiveness چاہے وہ کسی نوعیت کی ہو کھو دی۔ جب اس کا مدِ مقابل یعنی "مذہب کا جاہلی تصور" میدان سے ہٹ گیا۔ اور اس نے گرجاؤں۔ مکانات کے پُرسکون گوشوں، عبادات و رسومات، اور بوڑھے اور جھکے ہوئے اشخاص کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔ جب تک "جاہلی مذہبی افکار" اور ان کے نتائج

ہ ـــــــ یعنی مادی افکار" میں نظری اور عملی کشمکش ہوتی رہی۔ اس
وقت تک ثانی الذکر کے لئے میدان صاف ہوتا رہا۔ لیکن جونہی "مذہب"
(جیسا کچھ بھی وہ تھا) نے ہاتھ پیر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے کو ہی اپنی عافیت کوشی
کے لئے مفید خیال کیا۔ اور تمدنی نظام کا سارا بوجھ "مادیت" کے کندھوں پر
پڑا تو اس وقت اس نئے فکر کی حقیقت کھلی، اور اس کی خوبی یا ارتقاء
کے طور پر نہیں بلکہ اس کی کمزوری کے طور پر بہت ہی جلد ایک اور "ذہنی بغاوت"
"دوراز" اور دی" کا چرچا شروع ہوگیا۔

ہم گذشتہ سطور میں بتا چکے ہیں کہ جس زمانہ میں مسخ شدہ عیسائیت
اور نئے مادی افکار میں ایک "جنگِ مناظرہ" جاری تھی۔ اور ایک طرف سے
"دعویٰ" اور دوسری طرف سے "جواب دعویٰ" پیش کیا جا رہا تھا۔ اس وقت
ادب کے محل سرا میں "رومانیت" کے خوبصورت چراغ روشن ہوئے۔ جس کا
تعلق زیادہ تر جذباتیت سے تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایک جذبات پرست دور
میں یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ پھر اسی طرح جب مادی نظام کی مشینیں رفتہ رفتہ
یورپ والوں کے ذہنی میدان میں اچھی طرح گڑ گئیں اور زندگی میں ایک
طرح کا ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہو۔ تو "حقیقت پسندی" نے اپنا روئے منور دکھایا
ادب کے پرستار مجرد فکری اور ذہنی کاوشوں کو ادب سے خارج کر دینے پر
تل گئے۔ جس طرح ان کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ زندگی کے معاملات میں
مابعد الطبعی نظریات Metaphysical Theories
کو داخل نہ کیا جاوے اسی طرح انہوں نے اپنے ادب سے بھی ان عناصر کو خارج
کر دینے کو تہیہ کر لیا۔ چاہے وہ اس میں کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔
اب ہمیں اس امر کی وضاحت کرنی ہے کہ مادیت کی ناکامی یا اس کی خامیوں سے
جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ایک طرح کی بغاوت رونما ہوگئی۔
مثلاً "معاشیات" میں سرمایہ داری (Capitalism)
کے خلاف رابرٹ اوون (Robert Owen)
لوئی بلان (Louis Blanc) فوری ایر (Fourier)
سینٹ سائمن Saint Simon اور سب سے بڑھ کر کارل مارکس
Karl Marx اور اس کے "ہم زلف" اینگلز
Fredric Engles کے نظریات و افکار کی اشاعت
سیاسیات میں ملوکیت Imperialism کے علی الرغم
انتہا پسند جمہوری (Radical Democratic)
افکار پنپنے اور بالغ ہونے لگے۔ اسی طرح ادب میں بھی اس عام بحرانی کیفیت
اور ایک وسیع و ہمہ گیر انتشار ذہنی کے نتیجے کے طور پر جو کارل مارکس اور اس کے
گروہ طبقے کے رجحان کے مطابق محض سرمایہ داری اور امپیریلزم کے خلاف
کوئی تعمیری انقلاب یا "جواب دعویٰ" نہ تھا۔ بلکہ مادیت کے منفی Negative
نظریات کی کمزوری اور خود سرمایہ داری کے ضمیمے کے طور پر وجود میں آیا۔ اور ایک
لحاظ سے اس کی تکمیل کرتا تھا۔ "باغی عناصر" کا ظہور ہونے لگا۔ قدیم ادبی اعتقادات و
روایات (Conventionalism) چاہے وہ "رومانیت"
کے ہوں یا "حقیقت پسندی" کے۔ سب کے خلاف ان نئے عناصر نے جو "جدیدیت"
(Modernism) کے معصوم نام سے موسوم ہوئے سخت تشدد
اور دشمنی کا علم بلند کیا۔

آج کل ہندوستانی ادیبوں میں اس "جدیدیت" کا بڑا چرچا ہے۔
اور یورپ کی طرح یہاں بھی نئے سیاسی، معاشی اور تاریخی نظریات کے ساتھ
ساتھ "جدیدیت" زندگی میں داخل ہو رہی ہے۔

اس نئے رجحان کا بنیادی کردار دراصل لفظ "بغاوت" سے تعبیر کیا
جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا مدار نہ صرف گذشتہ زمانہ کے ضابطہ بند ادب
Classicism رومانیت، اور حقیقت پسندی کے خلاف
لغات پر رکھا گیا ہے۔ بلکہ خود اپنے وجود کے خلاف بھی اس میں ہر آن
"بغاوت" ہی کی جاتی ہے۔ ہر وہ ترکیب، محاورہ، مثال، تشبیہ، استعارہ،
اور تلمیح جو ایک دفعہ استعمال کی جائے، نئے ادب میں دوسری دفعہ استعمال
کرنا گناہ عظیم ہے۔ "یہ جدیدیت" اگرچہ قدامت پسندی اور رومانیت
وغیرہ کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر ظہور میں آئی ہے لیکن اس انوکھے
ردِ عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ خود اس میں کوئی ضابطہ قانون یا کلیہ موجود
نہیں، جس طرح پچھلے زمانہ میں قدامت کے علی الرغم رومانیت نے جنم لیتے
ہوئے دنیا کو کچھ نئے اصولوں سے واقف کرایا، اور یہی کام "حقیقت
پسندی" نے بھی انجام دیا۔ یعنی اس نے بھی ایک "اصول اور قاعدہ" پیش کیا
مگر اس "انقلابی جدت پسندی" نے اپنا کوئی "اصول یا قاعدہ" پیش نہیں کیا
بلکہ تمام اصولوں اور قاعدوں سے آزاد رہنے کا نام ہی اس کے نزدیک ادب
کی اہم ترین خصوصیت قرار پا گئی۔ تاہم غیر ارادی طور پر اس میں چند
خصوصیات پیدا ہوگئیں اور یہ تین شاخوں میں بٹ گئی ہے۔

(۱) پہلی شاخ کا خاصہ ہے، انداز بیان کی انتہائی سادگی جس سے
مراد یہ ہے کہ لکھنے والا اپنے خیالات کو نہایت صاف اور "عریاں" طریقہ پر
پیش کرے، چاہے وہ انسانی زندگی کے کسی شعبے اور اس کے کسی فعل سے

سفلی چھوٹے موٹے الفاظ، استعاروں، محاوروں اور اشارات کے "مہذب لبادے" کو یک لخت چاک کر دیا جائے۔ مثلاً کسی عورت اور مرد کے رشتے کو "نیا ادیب" ان کے تمام صنفی افعال اور جذبات کی پوری تفصیل کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے بیان کرے گا۔ کسی آوارہ عورت کے کردار کا نقشہ پیش کرتے وقت "جدید ادب" کا پیرو اس کی تمام آوارگی کو مِن وعَن پیش کرنے کی سعی کرے گا۔

(۲) دوسری شاخ "مقصدیت" کی علمبردار ہے۔ اس میں قدیم معاشرتی اصولوں پر تنقید، طبقاتی کشمکش کا تذکرہ اور اس کے ایک مفید حل کے طور پر مارکسی خیالات کا تعارف بالعموم اس کا شیوہ بن گیا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کے نئے مسائل کا حل اس وقت مارکسی خیالات میں پایا جاتا ہے اس لئے ادبی مقصدیت کو مارکزم سے مملو کرنا لازمی ٹھہرا۔ عام طور پر شاخ کے ماننے والوں نے اپنے آپ کو "ترقی پسند" کا لقب دیا ہے لیکن دراصل وہ صرف "اشتمالیت پسند" ہیں مگر جب انہیں صاف طور پر اشتمالیت پسند کہا جاتا ہے تو وہ بہت چڑتے ہیں اور جھنجلا کر کہہ اٹھتے ہیں کہ ان "رجعت پسندوں" کو کیا معلوم کہ "ترقی پسندی" کیا ہے اس کے بعد وہ ترقی پسندی کا ایک ایسا تجزیہ پیش کرتے ہیں جسے محض ایک چیستاں (Riddle) اور پہیلی کہنا زیادہ بہتر ہے۔ ستم ظریفی تو دیکھئے کہ یہ لوگ خود ہی بنیادی طور پر اس امر کے قائل ہیں کہ "پرولتاری انقلاب" ہی زندگی میں حقیقی اصلاح اور تغیر کا موجب ہو سکتا ہے۔ آسمانِ فکر وضمیر کا درخشاں ترین ستارہ۔ "کارل مارکس" ہی تھا لیکن ان تمام باتوں پر سر ہلا دینے کے باوجود جب علی الاعلان ان کو اشتمالیت پرست اور کمیونزم کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ تو یہ حضرات نہ جانے کیا سوچ کر اعتراض شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس کی تردید کے لئے تمام زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں۔ اگر "ترقی پسند" ادیب اشتمالیت کے پیرو نہیں۔ اور انسانی زندگی کا مقصد اشتمالی انقلاب کو نہیں بلکہ کسی اور چیز کو قرار دیتے ہیں تو آخر وہ "اور چیز" کونسی ہے؟ کیا "ترقی پسند ادیب" کے لٹریچر میں اس کی جھلک دکھائی جا سکتی ہے؟ یا اشتراکیت اور اشتمالیت کے علاوہ انہوں نے کسی دوسرے فلسفہ کی تبلیغ و اشاعت کو بھی "ترقی پسندی" قرار دیا ہے یا قرار دینے اور تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہیں؟ دراصل یہ لوگ آپ اپنی حقیقت سے نا واقف ہیں انہوں نے روسی انقلاب کو سمجھنے کی کوشش کی جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مذہب کے جاہلی تصور کے خلاف ہوا اور نہ اس "تفلسف" کا تجزیہ کیا جو بیسویں صدی میں مادیت اور سرمایہ داری کے بعد کسی تعمیری فکر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی تخریب اور تنزل کے مظہر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ ان کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو کسی شدید طوفان میں خشکی سے بہہ کر چاروں طرف پانی کی خوفناک موجوں سے گھر گیا ہو۔ اور جسے دور دور تک ساحل کا کوئی نشان نظر نہ آتا ہو۔ جس کی وجہ سے اس نے ان ہلاکت خیز موجوں ہی کو ساحل سمجھ لیا ہو۔ اور اپنی زندگی اور بقا کے لئے بھی انہیں کو سہارا بنانے کی جد و جہد میں مصروف ہو۔

(۳) تیسری شاخ "حقیقت پسندی" کی مخالفت میں واقعات اور حقائق کی تصویر کشی کے بجائے زیادہ زور "مجردات" Abstract Ideas پر دیتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ خصوصیت "مقصدیت" ہی بے جا غلو کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس لکھنے والے کے پیش نظر کچھ مقاصد ہوں اور جو شخص ایک ادیب ہیں۔ بلکہ ایک "مصلح" اور "انقلابی" بننے کا خواہشمند بھی ہو وہ اپنا وقت کسی سوسائٹی کی تصویر کشی میں ضائع کرنے کے بجائے زیادہ توجہ اپنے خیالات کی اشاعت میں دے گا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو "اشاراتی ادب" (Symbolism) یا مجرد قوتوں کے "تشخص" اور ان کے ذریعہ افکار کی اشاعت کا طریقہ رائج تھا۔ وہ اسی کی ایک غیر ترقی یافتہ شکل Underdeveloped Form تھی۔

(۴) چوتھی شاخ "مستقبل پسندی" Futurism کی ہے۔ اس کا پیرو ہمیشہ حال سے بیزار نظر آتا ہے وہ ہرگز اس بات کا متمنی نہیں کہ کہیں پیچھے جا کر کھڑا ہو۔ بلکہ وہ ہر آن ایک نئی اڑان کا خواہشمند ہے۔ اسے حاضر و موجود پر کبھی اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ ادب کی گاڑی کو ہر وقت مستقبل کے کسی سراب کی طرف دھکیلتے رہنا چاہتا ہے۔ "مستقبل پسندی" کا یہ خیال بھی مقصدیت ہی کا شعبہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن مقصدیت میں پھر بھی ایک طرح کا ٹھیراؤ اور سکون ہے "مقصدیت" ایک مبہم اور غیر واضح لفظ ہے۔ اور "مستقبل پسندی" ایک واضح اور غیر مبہم اصطلاح ہے اس لئے "جدیدیت" کا سب سے نمایندہ دراصل یہی خیال ہے اور اس کا سب سے زیادہ اہم جوہر بھی یہی ہے۔ "مستقبل پسندی" کا پیرو ادب کے مختلف شعبوں نظم، نثر وغیرہ میں صرف کسی قسم کا ضابطہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ وہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ ایک نئے اور تبدیل شدہ انداز میں اپنے خیالات کو پیش کرنے کا خواہشمند ہے۔ چنانچہ اس کے ایک سب سے بڑے اور متعصب وکیل میری نٹی (FT Marin...) نے جو اطالیہ کا باشندہ ہے۔ اس انوکھے فکر کی تبلیغ ان الفاظ میں کی ہے۔

"We futurist uphold the idea of a great and strong scientific literature, which, from all and classicism and pedantic purism, will magnify the

most-recent discoveries, the new intoxication of speed, and the celestial life of aviators. Our poetry essentially and totally rebelling against all used forms. The tracks of verse must be torn up and the bridges of things already must be blasted and the locomotives of our inspiration must be started toward the coming, toward the boundless fields of the New and the future. Better a splendid disaster than a monotonous race daily re-run; we have put up too long with the station master of poetry, the conductors of scanning, and the punctual time-tables of prosody."

[illegible] ہے کہ جدید [illegible] طاقت [illegible] ادب کو [illegible] ہے۔ [illegible] وطنی یا مذہبی [illegible] ہے۔ اور جو پرانی اور فرسودہ خیالی [illegible] عادات اور [illegible] سے محبت کرتا ہے وہ [illegible] پر رینگنے والے کیچووں [illegible] کار کے بجائے تیز رفتاری کے [illegible] ہوا [illegible] کرنے والوں [illegible] کرتا ہے [illegible] ہیں وہ [illegible] ہوئے [illegible] خلاف بغاوت کرتی ہے [illegible] شاعری کے تمام [illegible] کو [illegible] ہے۔ [illegible] نسل کو [illegible] والے تمام [illegible] ہے۔ [illegible] تخلیقی ادب کی تمام کارگزاریوں کو [illegible] آنے والے دور کی طرف بڑھنا ہے۔ [illegible] کی طرف [illegible] کی [illegible] ہے اور [illegible] مستقبل [illegible] اس بات سے کہیں بہتر ہے کہ [illegible] اور

'قانون پسند ادب' کو بار بار استعمال کیا جائے۔ ہم اپنی شاعری کے پرانے ہدایت کاروں کے احکامات پر بہت چل چکے۔ "فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات" کے اوزان اور پیمانہ جات کے نتیجے میں ہم نے ایک عمر گزار دی اور فن عروض اور ردیف، قافیہ کے "نظام نامے" پڑھتے پڑھتے ہم نے اپنی زبانیں خشک کر لیں۔ لیکن اب ان چیزوں کا کوئی [illegible] نہیں رہا۔"

یہ ہے جدید ادب کی "مستقبل پسندی" اگرچہ یہ بظاہر صرف فن اور تکنیک تک [illegible] ہوتی ہے۔ لیکن اس کا تعلق جتنا فن کے "انتشار" سے ہے اتنا ہی خیالات اور افکار کے [illegible] سے بھی ہے۔ یہ ادب جتنا تشبیہ، محاورے، استعارے اور ضرب الامثال کا اس کے پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دینے پر تلا ہوا ہے۔ اتنا ہی یہ ہر نئے فکر اور ہر نئے سوال کو اس کی پیدائش کے اولین لمحہ میں نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ [illegible] "غصے" سے ادیبوں کو ابھی اس "نفرت" کا احساس رہے۔ لیکن حس ذہنی [illegible] کے سیلاب میں ان کے ذہن بہہ رہے ہیں۔ ان کا لازمی نتیجہ یہی فکری پراگندگی اور "دماغی ہیضہ" ہے۔

(5) "افادیت پرستی" Utilitarianism

مادی فلسفے اور عقیدے کا لازمی جزو ہے اور جو مادیت کے ساتھ ساتھ ہی طرح کو پہنچا ہے۔ نئے ادب کی ایک شاخ پر مسلط ہے۔ مگر یہ "خیر خیالات" اور تکنیک دونوں سے یکساں طور پر وابستہ ہے۔ اور ایک لحاظ سے "قاعدے" اور "ضابطے" سے بچنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ افادی ادب کا گرویدہ وقت۔ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے اپنے ادبی مقاصد کو بھی بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی ملک حالت جنگ میں [illegible] وہاں کا ادیب اپنی قوم کے جذبات کو دشمن کے خلاف بھڑکانے میں ساری قوت صرف کرے گا۔ ابھی حال میں جب جرمنی اور روس میں لڑائی ہو رہی تھی تو روس کا ہر نیا ادیب اپنا سارا زور قلم روسی سپاہی کو جرمنوں کے مظالم کی [illegible] داستانیں [illegible] سنا کر جوش دلانے میں صرف کر رہا تھا۔

(6) "لذت پسندی" Hedonism بھی جدیدیت کے تاج کا [illegible] ہوتی ہے۔ اس تصور کی پیدائش کے پیچھے ادیب کا صنفی میلان ہے جو اس کی عمر کے مختلف مدارج اور حالات کے ساتھ ساتھ مختلف روپ اختیار کرتا ہے۔ فرائڈ نے [illegible] کو وجہ جواز بخشنے کے لئے ایک فلسفہ تراشا تھا۔ اس فلسفہ کا دلدادہ [illegible] میں لذت کی تلاش کرتا ہے حتیٰ کہ گندے کپڑوں کی بدبو میں اس کے لئے لذت ہی لذت ہے۔ وہ ظاہر پرست اور خیال پرست بھی ہوتا ہے۔ اس نظریے نے [illegible] بگڑ کر اخلاق ادب کو جنم دیا۔ لذت پسند ادیب شروع میں تو اپنے اس مذہب کو [illegible] دیکھنے سے یہ اقدام کر رہا لیکن رفتہ رفتہ وہ اس افیون کا عادی ہو گیا

دور دن دن اس کی چاٹ بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس میں اور عہدِ عتیق
حسن پرستوں sex worshippers میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

یہ ہے جدیدیت کا مختصر تجزیہ۔ اس کی جن چھ شاخوں کا ذکر کیا گیا ہے۔
اگرچہ ان کے پیرو الگ الگ دیکھے جا سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی
جان لینا چاہیئے کہ جدیدیت کی تمام شاخوں کی خصوصیات بیسویں صدی کے
آغاز سے لیکر جنگِ عالمگیر ثانی کے اختتام تک سب شاخوں کے پیرووں کی مشترک
خصوصیات ہیں۔ اس تقسیم کی ضرورت صرف اس لئے پیش آتی ہے کہ ان میں سے ہر
شاخ اپنی مخصوص نوعیت میں دوسروں سے زیادہ آگے ہے اور فن کاروں کے یہاں
افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ لیکن جدیدیت کے اس تجزیہ کے بعد اب ہمیں یہ بھی جان
لینا چاہیئے کہ دوسری جنگِ عالمگیر کے بعد سے ادب پر ایک عجیب اثر مرتب ہو رہا ہے
اور اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ جدیدیت کی وہ قدریں جنہیں مادہ پرستانہ تصورِ
زندگی، حسن اور جمال کے جنس پرستانہ نقطۂ نظر۔ اور آرٹ میں انتشار کو ترقی پسندی
قرار دینے والے زاویوں نے پیدا کیا تھا۔ انسانیت کی عظیم معاشی معاشرتی اور
اخلاقی تباہی کے پیچھے اکھڑ کر ٹوٹنے لگی ہیں۔ اب عام طور پر سنجیدہ شاعر۔ افسانہ
نگار اور ناول نویس صالح اور تعمیری قدروں کے لئے بے چین نظر آتا ہے۔ اس جگہ
اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ صرف اشارۃً یہی بتایا جا سکتا ہے کہ "جدیدیت"
اب مرحوم و مغفور ہوتی جا رہی ہے۔ پرانیسہ تو ل۔ تو نتر۔ اور روس کے
فلسفیوں نے اپنی تحقیقات سے زندگی کے زوال اور ارتقاء کی سارے نشان دہی
کا بہ کر دیا ہے۔ اگرچہ ان کے نقطۂ نظر میں ابھی پوری وسعت نہیں پیدا ہوئی ہے لیکن
انہوں نے اتنی بات تو کھول کر رکھ دی ہے کہ دنیا میں ہمیشہ سے انسانیت کے عروج و
زوال کی مستقل قدریں رہی ہیں۔ تمام دنیا کے تمدن ایک خاص محرکات کے
تحت زوال کا شکار ہوئے۔ خاص محرکات نے انہیں اوپر اٹھایا۔ جیسا کہ تاریخ

تک یہ فلسفی اور مورخ پہنچے ان کو ادیبوں نے اپنی آنکھوں دیکھے واقعات کے ذریعہ پیش کیا۔
'Chicago Confidential' 'New York
Confidential' اور 'Washington Confidential'
جدیدیت کی بنیادوں پر تعمیر شدہ سماج کو اس بے دردی کے ساتھ عریاں کر کے پیش کیا ہے
کہ ان کے پڑھنے والے اس گھناؤنی تصویر سے خوف زدہ اور اس میں مبتلا ہوئے بغیر
نہیں رہ سکتے۔

جدیدیت سے یہ نفرت ہو سکتا ہے کہ کسی ایسے ردِ عمل کی شکل میں ظاہر ہو۔ جس
میں عہدِ جدید کے سماج عامہ کو بھی مغربی دنیا پامال کر کے رکھ دے جیسا کہ مسخ شدہ
عیسائی مذہبیت کے ردِ عمل کے وقت اس نے اس کے ساتھ [illegible] تمام عوام
کو ایک ساتھ پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ چاہے ایک محقق اور ریسرچ اسکالر ایسا نہ
کرے لیکن ادیبوں اور آرٹسٹوں سے یہ غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس نازک
موقع پر جبکہ مغربی دنیا اب پھر ایک نئے موڑ پر کھڑی ہوئی ہے اور اس کا ادب تیزی
سے ایک نیا موڑ مڑنے والا ہے۔ مغرب کو سیدھی راہ دکھانے کی شدید ضرورت ہے
اور غالباً یہ کام اب مشرق کے سپوت کریں گے۔ ان میں بھی وہ لوگ جو زندگی اور
آرٹ کا تعمیر پرستانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں جو زندگی کے اصل اور ابدی حقائق کو حقیقت پسندی
کی اصلی بنیاد مانتے ہیں۔
جمال اور حسن کو پاکیزہ سیرت اور عمل صالح میں دیکھتے ہیں۔ اور اس ولولہ
اور لگن کو جو ہمیشہ سے انقلابی اور تعمیری کردار رکھنے والوں کا
خاصہ ہے۔ انسان کی فطری روحانیت پسندی کے لئے ایک
اساسی قدر کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔

(ختم شد)

تسکین قریشی

○

جرأت شوق باندازۂ احساس نہیں
تجکو اے دل ابھی دعوائے جنوں راس نہیں

کون افتادِ رہِ عشق ہے جو راس نہیں
تم مقابل ہو تو کیا دوری ہے کیا پاس نہیں

آہ تنہائی دل، آج کوئی پاس نہیں
عشق کو ہوش نہیں، حسن کو احساس نہیں

رنگ و نکہت کو نہ دیکھو کہ اسی گلشن میں
وہ بھی کلیاں ہیں جنہیں موسم گل راس نہیں

عشق ہے آہ، وہ غارت گرِ دل جس کے بغیر
مستی ہوش نہیں، لذتِ احساس نہیں

دے تو رکھا ہے ہمیں وعدۂ پیہم کا فریب
کون کہتا ہے وفاؤں کا انھیں پاس نہیں

زندگی حادثۂ مرگ مسلسل ہے، اگر
شورشِ شوق نہیں، شدتِ احساس نہیں

جادۂ شوق میں ہر غم ہے چراغِ منزل
دل ہو روشن تو کہیں تیرگیِ یاس نہیں

دہر کے ہر غم و راحت سے گذر جا اے دل
کوئی حالت بھی یہاں قابلِ احساس نہیں

غمِ دوراں سے بھی لطفِ غمِ ہستی نہ ملا
دل کو کچھ سوزِ محبت کے سوا راس نہیں

نہ سہی شاعرؔ "فن کار" مگر اے تسکیںؔ
میرے شعروں میں کہیں پستیِ احساس نہیں

حفیظؔ میرٹھی

○

کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی

اب آدمی کا ٹھکانہ، نہ کائنات کی خیر
سُنا ہے اہلِ خرد ہو گئے ہیں سودائی

عوام کو یہ زمانہ خدا بناتا ہے
کہاں یہ بھیڑ، کہاں تیری شانِ یکتائی

ہزار حیف کہ ہم تیرے بے وفا ٹھہرے
ہزار شکر کہ ہم کو ہوس نہ راس آئی

اب اپنے جیب و گریباں کا کیا سوال رہا
جنوں کا ہاتھ بٹانے کو خود بہار آئی

اُسی کی راہ میں آنکھیں بچھائے گی منزل
وہ عزم جو نہیں محتاج ہمّت افزائی

حیات پُوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم
تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی

مُشاعروں میں حفیظؔ آج کل وہی جائے
کہ جس کو حد سے زیادہ ہو ذوقِ رُسوائی

کوثر نیازی

بے قراروں سے ، بے سہاروں سے
لوگ چڑتے ہیں غم کے ماروں سے

لالہ و گل سے کھیلنے والو !
پڑ گیا واسطہ جو خاروں سے ؟

لٹ گیا جب چمن تو سوچ آئی
کیا بری تھی ، خزاں بہاروں سے

جن کا دل کو بڑا سہارا تھا
وہی دیکھا کئے کناروں سے

اے دلِ زار ! بر ملا کہہ دے
بات بنتی نہیں اشاروں سے

اس کو تیراک کون کہتا ہے ؟
جو نہ لڑ جائے تند دھاروں سے

کچھ نہ کچھ آس بھی ہے اے کوثر
اور نالاں بھی ہوں سہاروں سے

شاکر تسلیم

کیا خوب ہیں یہ اہلِ نظر بھی
پھولوں سے رغبت کانٹوں کا ڈر بھی

تو ہی نہیں ہے حیران اے دل
کھوئی ہوئی ہے اُن کی نظر بھی

ڈھلتے ہی ڈھلتے ڈھلتی ہیں راتیں
ہوتے ہی ہوتے ہو گی سحر بھی

دونوں ضروری ہیں زندگی میں
کیفِ نظر بھی سوزِ جگر بھی

پھر ایسا موقع شاید نہ آئے
راہِ وفا میں جاں سے گزر بھی

آئے تو کوئی پیغامِ گلشن
اُڑ جائیں ہم تو بے بال و پر بھی

اپنا تو فن ہے انمول شاکر
آگے ملیں گے کچھ پیشہ ور بھی

راشد کیرانوی

○

زندہ باد اے تلاشِ غمِ معتبر
اب جنوں بھی نہیں ہے مرا ہم سفر

کیا ارادہ ہے اے میرے ذوقِ سفر
منزلیں پُرسکوں راستے پُرخطر

ظلمتیں چاہے کتنی ہی کوشش کریں
ان سے رُکتی نہیں ہونے والی سحر

ذرّے ذرّے نے یوں خیر مقدم کیا
جیسے واقف ہو مجھ سے ہر اک رہگذر

کیسے دیکھوں یہ آرائشِ انجمن
زخم خوردہ ہے اے دوست میری نظر

جا رہا ہے عجب شان سے کارواں
راہ رو مطمئن رہنما بے خبر

احمد نسیم ہمنانگری

○

سحر کا نور بھی ہے، تیرگیِ حال کے بعد
خوشی کا دور بھی آجائے گا ملال کے بعد

مری حیات تھی دشمن، مری حیات ہے دوست
ترے خیال سے پہلے، ترے خیال کے بعد

"فضا تمام نشیمن، فضا تمام قفس"
ترے زوال سے پہلے، ترے زوال کے بعد

ہماری فکر میں ظلمت، ہماری فکر میں نور
ترے جمال سے پہلے، ترے جمال کے بعد

مٹیں گے نقشِ صداقت نہ اہلِ نخوت سے
یہ زخم اور ابھرتے ہیں اِندمال کے بعد

نسیم دل کی حقیقت تھی ایک ذرۂ خاک
یہ آفتاب بنا پرتوِ جمال کے بعد

ابنِ احمد بی اے گورکھپوری

○

اگر ہم شادماں ہوتے تو غم خانے کہاں جاتے
ہماری بے بسی کے تازہ افسانے کہاں جاتے

ہماری بیخودی بھی مصلحت اندیش تھی ساقی!
جو ہم ہشیار ہو جاتے تو میخانے کہاں جاتے

غنیمت ہے چمن میں کچھ تو ہم رنگِ جنوں نکلے
یہ کانٹے پھول بن جاتے تو دیوانے کہاں جاتے

مجھے شکوہ بھلا کیوں ہو کسی کی بے نیازی کا
اگر وہ اپنے ہو جاتے تو بیگانے کہاں جاتے

مداوائے غمِ پنہاں تو کچھ مشکل نہ تھا اے دل
مگر حسرت بھرے شکوں کے نذرانے کہاں جاتے

مُستفیض منصوری اے

○

میرا ہر سجدہ تصنع ہے عبادت مکر و کیں
ان قیودِ ناروا کو نہیں سکتی جبیں

دستِ فطرت نے بنایا ہے تجھے نقشِ حسیں
نقش تیرا محبت، ہر ادا حسن آفریں

صِدق پروانہ نہ تھا ہر آشنائے حسنِ دوست
ہے زبانِ شمع پر بھی آفریں صد آفریں

حق پرستوں کی نگاہیں ہو گئیں باطل نواز
پھر زمانہ ہنس رہا ہے زہر خندِ آتشیں

رہنما ہی مستند ہے اور نہ راہی معتقد
یہ وہ عالم ہے جہاں میری کوئی منزل نہیں

اقبال نسیم عثمانی

کالی شیروانی

جی چاہتا ہے۔ کچھ کہوں مگر درمیان میں گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی ایک ایسی مشکل آپڑی ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور پھر چارٹ کہوں یا نہ کہوں والے تذبذب کو دیکھ کر اگر خدانخواستہ آپ فرمائیں "ڈوب مرو" تو صاحب! ڈوب جانا اور ڈوب کر سچ مچ مر بھی جانا کم از کم اپنے بس کا روگ نہیں۔ ویسے ہم لاکھ غیرت مند سہی مگر اتنے غیرت مند بھی تو نہیں کہ بات کی بات میں یہ بات جان سے بیٹھیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ابھی عمر کی بہاریں ہی کتنی دیکھی ہیں۔ لاکھوں ارمان ہیں اور کروڑوں حسرتیں اور پھر بقول شخصے۔ ع

"ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے"

اب یہ دم نکلنے والی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ پچھلی تین سردیوں سے مستقل ارادہ کر رہا ہوں کہ میں بھی اللہ کا نام لیکر ایک کالی شیروانی بنا ڈالوں۔ مگر بھلا ہو مُنّے کی اماں کا کہ ہر مہینہ کی بیس تاریخ کو بجٹ کچھ اس طرح فیل کرا دیتی ہیں کہ مستقبل سے گھبرایا ہوا حال کے چرخہ کی چرخ چوں چیخ چوں کو جاری رکھنا ہی دوبھر ہو جاتا ہے۔ اور یہ گھریلو چرخہ کمبخت اپنی گردش میں گردشِ چرخ سے کم نہیں۔ شاید اس کی گردش سے کسی خوش نصیب کے دن پھر بھی جاتے ہوں مگر اس کی گردش قسمت کا ایک ایسا چکا تُلا بیٹا۔ بندھا ٹکا دیکھے کہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی اپنی قلم بند "آمدنی" اس طرح ہاتھ جھاڑ اور مُنہ پسار کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے کسی مُردہ کو مٹی دے کر اب دیا ہی چاہتے ہوں —— اب آپ ہی بتلائیے کہ "کالی شیروانی" کیسے بنے۔ پیٹ پر پٹی نہیں باندھی جا سکتی۔ منّے کی اماں کا کہا نہیں ٹالا جا سکتا۔ اس پر بھی جو کچھ کماتا ہوں وہ سب پیٹ کی نذر۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں یا میری "وہ" خدانخواستہ نکھٹو ہیں اور جو کچھ ملتا ہے۔ دلّی کے کرخنداروں کی طرح چاٹ پکوڑی میں اڑا دیتے ہیں۔ اگر یہی ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ مگر یہاں تو رونا اس کا ہے کہ جو کچھ ہمارا نظام ہمیں ہماری مزدوری دیتا ہے وہ اس قدر قلیل ہے کہ "اماں تے چٹ کھا لیے" تولیا۔ "بھکارے" ہی بمشکل قائم رکھے جا سکتے ہیں۔ اب پیٹ کی ان تمام دشواریوں کے پیشِ نظر پھر وہی سوال آتا ہے کہ کالی شیروانی کیسے بنے ؟

اسی خیال اور اسی تصور میں مکمل تین گرمیاں، تین برساتیں اور تین سردیاں گذر چکی ہیں۔ مگر اب بھی قسمت میں وہی ڈھاک کے تین پات نظر آ رہے ہیں۔ باقی اللہ۔ اللہ اور خیر صلا۔

اوائل اکتوبر سے ہی شیروانی کا خیال لمبی لمبی سسکیوں میں بدل کر کچھ دورے کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے اور دسمبر کے اخیر تک تو یہ تمام ٹھنڈی ٹھنڈی سسکیاں جم جما کر ایک برف کی سِلّی بن جاتی ہیں اور میں جنوری کے یخ بستہ ایام میں بھی ٹھنڈی سِلّی اٹھائے کو بہ کو پھرتا ہوں مگر کوئی خدا کا بندہ اتنا بھی نہیں پوچھتا۔ کہ بھیا جمیل کیا حال ہے۔ آہ! کیسا خون سفید ہو گیا ہے دُنیا کا۔

اب اِس سال کی تازہ بتازہ سنئے کہ اکتوبر گذر چکا ہے۔ نومبر گذر رہا ہے اور شاید دسمبر گذر جائے گا مگر شیروانی کے بندوبست کا معاملہ ہنوز روزِ اوّل کی کھٹائی میں پڑا ہے۔ شاید نومبر ہی کی کوئی تاریخ تھی کہ مجھے بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ وہ میرے شاعر دوست بھی کچھ کم و بیش یہی تنخواہ پا رہے ہیں جو مجھے ملتی ہے۔ مگر ان کے پاس کئی کئی گرم شیروانیاں موجود ہیں۔ پوچھنا چاہیے کہ وہ اب تک اس کساد بازاری میں کہاں سے اور کس طرح مارتے ہیں —— یہ سوچتے ہی میں ان کے پاس پہنچا اور ابھی حرفِ مطلب زبان پر لایا ہی تھا کہ وہ اِس طرح مسکرا اٹھے جیسے ہماری بیماری کا ان کے پاس کوئی مجرب نسخہ موجود ہو۔ انہوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں فرمایا۔

"جمیل بھیا! ہماری یہ شیروانیاں شادی کی رہینِ منت ہیں۔"

میں مطلب سمجھتے ہوئے بھی بولا۔ کیا مطلب ؟

اور وہ اپنے سینہ بند نسخہ کی ادویات کو دِل ہی دل میں دہراتے ہوئے گل افشاں ہوئے۔

"بھئی! جب تنخواہ میں شیروانی کا کوئی بیونت نہ دیکھا تو مجبوراً شادی کر ڈالی۔ اور شادی پر کئی کئی شیروانیاں مل گئیں۔ اب کچھ سردیاں آرام سے

کٹ جائے گی۔ اور میں اپنے دوست کے بتائے ہوئے نسخہ اور اس کی ترکیب استعمال پر بھونچکا سا رہ گیا۔ کچھ دیر خواہ مخواہ سر کھجاتا رہا اور پھر خشک بالوں کی خشکی جھاڑتے ہوئے بولا۔

نہیں دوست! اس نسخہ کی تمام ادویات قیمتی اور ثقیل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شادی پر آئی ہوئی شیروانیوں سے سردیاں کچھ آرام سے کٹ جائیں گی مگر گرمیوں کے آتے ہی جو مالی مشکلات کے بخارات اٹھیں گے تو پھر منّے کی اماں کے ساتھ اس نے مجسم بخار سے سلٹ لینا کم از کم اپنے بس کا کام نہیں۔ کوئی اور سستا سا نسخہ ہو تو بتاؤ۔

مگر انہوں نے لاجواب ہو کر اپنی شیروانی کے پھیلے ہوئے کالر میں کسی ٹوٹے ہوئے پھل کی طرح گردن ڈال دی۔ اور مجھے دن ہی میں تارے نظر آ گئے۔ کچھ سوچ بچار کے بعد آخر خود ہی بولا۔

بھئی! یہ کوزہ گر کوزہ بناتا ہے اور ہر وقت دھیان رکھتا ہے کہ کہیں آگ کے بنائے ہوئے کوزہ کو ٹھیس نہ لگ جائے، کوئی بال نہ آ جائے تو کیا وہ تمام ادب نواز حضرات جو پہلے آپ کو شاعر اور ادیب گرداتے ہیں اور انہیں خوب خوب بناتے ہیں۔ ان کا کوئی مالی تعاون نہیں کر سکتے۔ جبکہ وہ غریب مالی مشکلات کی چوٹ پر چوٹ کھا کر کسی مٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹے جا رہے ہیں؟"

شاعر دوست مسکرائے۔ "اس غلط فہمی میں نہ رہنا بھیا! آج کل ادیب شاعر کی قیمت صرف واہ۔ واہ ہے۔ پیسے نہیں۔ یقین نہ ہو تو تجربہ کر لو ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔"

وہ یہ کہہ کر گھسیٹتے ہوئے مجھے ایک ریسٹوریٹ کی طرف لے گئے۔ ریسٹورنٹ کا منیجر خاصہ ادیب و شاعر گر قسم کا آدمی تھا جسے میں بھی جانتا تھا اور وہ بھی۔ ہم اپنا نجی ریسٹوریٹ کچھ کرسیوں پر دھار ہو گئے۔ اور ہمارے شاعر دوست کچھ توقف کے بعد میری طرف اشارہ کرتے ہوئے منیجر سے بولے۔

"کیوں بھئی چھجو! کیسی ہوتی ہیں ان کی کہانیاں۔"

"ایک دم لاجواب۔" منیجر نے جواب دیا۔ "تمہارے سر کی قسم تمہاری غزلیں اور ان کی کہانیاں ایک نشہ ہیں اور دو بھی دو آتشہ۔"

منیجر پھر اپنے ادبی لطیفہ پر مسکرایا۔ اور ہمارے شاعر دوست نے بھی مسکراتے ہوئے مجھے اشارہ کیا اور میں نے منیجر کو ہیچ نشہ میں ڈوبتا دیکھ کر موقع غنیمت جانا اور ایک دم برجستہ چائے کا آرڈر دے دیا۔ چائے پینے کے بعد خیال تھا کہ پیسے کیا دے گا۔ مگر از راہ تکلف پوچھ ہی لیا۔

"کہو بھئی چھجو۔ کتنے پیسے ہوئے؟"

اور اس خدا کے بندہ نے بلا جھجک فی البدیہہ ایک آزاد مصرعہ کہہ ڈالا۔
"کچھ نہیں صرف ساڑھے دس آنے۔"

شاعر دوست مسکرائے جیسے کہہ رہے ہوں۔ ادیب صاحب! یہ تو دینے ہی پڑیں گے۔ اور میں نے چپکے چپکے دایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر انگلیوں سے پیسے ٹٹولنا شروع کیا۔ مگر وہ بھی شمار میں ساڑھے آٹھ آنے نکلے۔ سوچا۔

ساڑھے دس آنے عام ریٹ ہے۔ ادیب اور شاعروں کو کچھ تو کنسیشن ہو گا۔ چونکہ اسٹوڈینٹ کو بھی سینما میں ایک روپیہ پانچ آنے کا ٹکٹ صرف پندرہ آنے میں ہی مل جاتا ہے۔ چنانچہ بسم اللہ کر کے ساڑھے آٹھ آنے کاؤنٹر پر بجا دیئے —— مگر ادیب گر منیجر دو کھوٹے پیسے میری طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ کوئی بات نہیں باقی ڈھائی آنے آ جائیں گے —— اور ہم دونوں دم دبا کر اس طرح بھاگے جیسے اس کی کوئی چیز اٹھا کر بھاگ رہے ہوں۔

غرض شاعر دوست سے بھی تیرہ وانی بنانے کا کوئی سستا سا نسخہ نہ مل سکا۔ چنانچہ اپنے بیت الحزن ہو چکر پنسل کاغذ سنبھالے حساب میں کمزور ہونے کے باوجود حساب لگاتا رہا۔ پندرہ کرایہ مکان۔ ساٹھ میں خورد و نوش کا سامان۔ بارہ قصائی کے۔ دس پیڑے دھلائی کے۔ پندرہ متفرقات پر اور باقی رہا شیر —— اُف! خدایا یہ تو ساری تنخواہ ہی تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ پنسل کاغذ پھینکتے ہوئے ایک تھکی تھکی جمائی لی اور گنگناتے ہوئے بولا ——

"منّے کی اماں! —— کوئی صورت نظر نہیں آتی!"

انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ کیسی صورت۔

میں نے کہا۔ "یہی کوئی اچھی صورت جس سے کم از کم دل بہلا سکیں" اور وہ کچھ بدگماں ہونے کے قریب ہی تھیں کہ میں قصداً مسکرایا۔ "تم بھی کو دا چار شنبہ ہو بیگم۔ اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ صورت سے مراد یہاں "ترکیب" ہے۔"

"شاعر صاحب فرماتے ہیں کہ اس سال بھی کالی شیروانی بننے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"ہٹو بھی۔ میں کیا جانوں کہ اب خیر سے باتیں بھی شاعری میں ہوا کریں گی۔ میں تو اچھی صورت کا نام سنتے ہی سہم گئی تھی ——"

"اللہ جانے کیا بات ہے جو آج یوں . . . . کیونکہ ان مردوں کو پھسلتے کچھ دیر نہیں لگتی۔"

میں نے کہا "ارے! کیا تمہارے نزدیک اب بھی کوئی بات نہیں!"

"خیر جی۔ بات ہو یا نہ ہو۔ شیروانی اس دفعہ ضرور بنے گی۔"

"میرا کچھ نہیں۔ میں تو گھر میں بیٹھی ہوں دو گھڑی ننگے سر بھی پھر لوں گی

تم خیر سے چار اُجلے پوشوں میں آتے جاتے ہو۔ تمہاری عزت اپنی عزت ہے۔"

اور میں اُن کی اِس بوڑھی گفتگو پر جس میں خوش ہوتا ہوا سوچتا رہا۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت دے ہماری پھوپی اماں کو کہ ایسی لائق بیوی کا ہاتھ میں ہاتھ تھما گئیں ورنہ اگر کسی چلتی پھرتی کو پلے باندھ جاتیں تو بس اپنا ڈبہ ہی گول تھا۔ آخر میں بھی کچھ طوطا سا بنتے ہوئے بولا۔

"یہ تو ٹھیک ہے منے کی اماں لیکن سوال تو یہ ہے کہ شیروانی بنے کیسے"

"یہ کونسا بھاری سوال ہے۔ اس مہینہ قرض خواہوں کا روک لینا۔ لیجئے شیروانی تیار۔"

اور واقعی یہ ترکیب میری سمجھ میں بھی آگئی۔ سوچنے لگا۔ کون کہتا ہے کہ عورت ناقص العقل ہے۔ مجھے تو یہ مرد ہی کچھ ایسے ویسے نظر آتے ہیں۔ غور کیجئے جس مسئلہ کو متواتر میں سال سے نہ حل کر سکا۔ آج منے کی اماں نے چٹکیوں میں حل کر ڈالا ——— چنانچہ شیروانی بنانے کا پختہ ارادہ کر لیا اور مجھے سچ مچ یوں آمدہ شیروانی دیکھ کر اصولاً بھی فرمائشی میٹر ابدلا ——

"شیروانی تو بنا ہی رہے ہو ——— اسی کے ساتھ میری چادر منے کا جوتا۔ اور پھر مسلہ کھلی آئے گا، منے کے ابا یہ سب چیزیں بھی تو ضروری ہیں نا۔"

اور میں جھنجھلا کر بولا۔ "جی ہاں! مرنا بھی ضروری ہے۔ اور اس کا ایک وقت معین ہے مگر تمہاری فرمائش کا کوئی وقت نہیں۔"

وہ خاموش ہو گئیں اور میں بڑبڑاتا ہوا سیدھا بازار پہنچا۔ اور تنخواہ ملنے سے پہلے ہی تمام مارکیٹ میں کالی سرج دیکھتا پھرتا رہا۔ ایک دوکاندار اتفاق سے بات والا تھا دور سے دیکھتے ہی چلایا۔

"آئیے آئیے کس چیز کی تلاش ہے آپ کو۔"

میں مسکرایا بھئی! تلاش ہی کیا سردی سے بچنے کا کوئی سہارا ڈھونڈتا پھر رہا ہوں ——

دوکاندار کچھ اتنا بھی اُڑواقع ہوا تھا کہ اس نے پہلے مجھے کیپسٹن کی سگریٹ سے نوازا۔ پھر اپنے ملازم کو پان کا آرڈر دیتے ہوئے سرج کے متعدد تھان اٹھا لایا۔

ایک دو تک میں بیٹھا ہوا اُن تمام تھانوں پر اپنے محبت بھرے ہاتھ اس طرح پھیرتا رہا۔ جیسے سوتیلی ماں کے روئی کتے پر پھیرا کرتا تھا۔ اور پھر اعتراض برائے اعتراض کے طور پر بولا ——— وہ سرج کچھ پتلی ہے۔ اس کا رنگ گھٹا گھٹا ہے۔ اور اس کا کپڑا نہایت گھٹیا ہے ——

دکاندار مسکرایا! "آپکے ہاتھ والی سرج بازار میں نایاب ہے۔ بابو جی پچھلے سال ۴۲ بیالیس روپے گز بکی ہے۔ لیکن اس سال کپڑے کا ریٹ گرنے سے میں آپ کو صرف تیس روپے گز دے سکتا ہوں۔ وقت کی بات ہے خریدنے کے بھی دام نہیں۔ اور میں تیس کا نام سنتے ہی ایسے کانپ اٹھا جیسے کوئی برسوں کا بیمار کڑوی دوا کے نام سے لرز رہا ہو۔ پھر بمشکل حواس مجتمع کرتے ہوئے بولا ——— بھئی! ہم تو تمہارے پرانے گاہک ہیں یاد ہو گا اب سے آٹھ سال پہلے تم سے ایک سرج لی تھی۔ کچھ تو رعایت ہونی چاہئے۔"

ایک دو آنہ کم کر دیجئے بابو جی!

دوکاندار کچھ حساب سا لگاتے ہوئے بولا۔

ارے بھئی! ایک دو آنے میں کیا ہوتا ہے۔

تو پھر دس بیس روپے کم کر ڈالئے۔ دوکاندار مسکرایا۔ اور میں کچھ خفیف سا ہوتے ہوئے بولا

"اچھا بھئی! ابھی لے لیں گے۔ مگر ابھی نہیں۔ تنخواہ ملنے پر۔"

اور وہ تنخواہ ملنے والا جملہ سن کر اس طرح اچھل پڑا جیسے سچ مچ کسی بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔ اس نے جلدی جلدی تھان لپیٹے اور ملازم سے مخاطب ہوا۔

"لو میاں! رکھ آؤ۔ بابو جی پھر لیں گے۔ ابھی صرف ٹرائی کرنے آئے تھے۔"

میں مسکراتا ہوا کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور وہ میرے ہونٹوں میں دبی ہوئی اپنی کیپسٹن کی سگریٹ حسرت سے دیکھتا رہا۔

پھر تنخواہ ملنے پر منے کی اماں کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق قرض خواہوں کے تمام حصے تجربے سرج خریدنے میں صرف کر ڈالے مگر شیروانی سلوانے کے سوال پر پھر دہی مہنگی والے درزیوں کا اثر شروع ہو گیا کیونکہ جس درزی کے پاس بھی پہنچا کسی نے بیس روپے سے کم پر ہاتھ ہی نہ رکھا۔ آخر کافی غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ منے کی اماں سینے میں کافی ایکسپرٹ ہیں۔ سوزن کاری کے مقابلوں میں وہ متعدد انعامات پا چکی ہیں اگر انہیں شیروانی کٹوا کر دے دی جائے تو وہ درزیوں سے بھی بہتر سی سکتی ہیں۔ چنانچہ میں سوچتے ہوئے ایک محلے والے درزی کے پاس پہنچا اور کپڑا اس کے سامنے پھینکتے ہوئے بولا۔

"لو بھئی! ماسٹر میں بھی آگیا۔ مگر شیروانی سلوانے کے لئے نہیں صرف کٹوانے آئے ہیں۔"

ماسٹر میرے اس حیرت انگیز انکشاف پر ایک دم بوکھلا گیا اور کچھ نیم خفگی کے انداز میں بڑبڑایا۔

"میں درزی ہوں جمیل بھیا! قصائی نہیں۔"

بات تو سچی تھی اور کڑوی بھی مگر میں وہ کڑوے کڑوے گھونٹ بھی حلق میں اُنڈیلتا ہوا ماسٹر کی خوشامد میں کرتا رہا اور آخر وہ میری خوشامدوں سے موم بتی کی طرح پگھلتا ہوا بولا۔

جمیل بھیا! کبھی کبھی تم ایک آدھ اچھی کہانی سُنا دیتے ہو اس لئے تمھاری خاطر صرف تمھیں کاٹے دیتا ہوں۔ پانچ تو لوگ کسی دوسرے سے نہ کہنا۔

اور میں تم درد ویش بجائے صد ویش پانچ ہی دینے پر تیار ہو گیا۔ دوسرے دن کٹی پھوٹی شیروانی مُنّے کی امّاں کو دیتے ہوئے بولا ــ پورے پانچ لئے ہیں ظالم نے۔

اُوئی اللہ! پانچ ـــــ ایک دم ہاتھی کا پاؤں ـــــ

ہاں۔ہاں۔ وہ تو یہ پوچھو کہ اپنا ملنے والا تھا جو پوری شیروانی کے پانچ لے لیا۔ ورنہ دلّی میں تو صرف گلا کاٹنے ہی کے دس لے لیتے ہیں۔

اور وہ ایک دم مسکرائیں جیسے کچھ کھلکھلا دینا چاہتی ہوں۔ اور پھر انھوں نے بچّے کا جب شیروانی سی کر تیار کر دی تو مجھے اس پر ڈھیروں پیار آ گیا۔ اور نعمت کے طور پر ایک چھوٹا سا قصیدہ۔ یاں پر آ ہی گیا۔

مُنّے کی امّاں! یہ تمھاری عنایت ہے تمھاری شیروانی بن گئی۔

بھئی واللہ ایسا بُرا زمانہ جا رہا ہے کہ بڑے بڑے لاٹ صاحب قسم کے اُجلے پوش بھی اِدھر اُدھر سے بٹور بٹار کر کچھ او نے پونے اگر شیروانی کا کپڑا خرید بھی لیتے ہیں تو پھر سلوانے کی ہمت تک نہیں پڑتی اور وہ صندوق بکس میں اس طرح سنگوا یا ہوا رکھا رہتا ہے جیسے وراثت میں ملا ہوا کوئی تبرک ہو جسے گاہے گاہے وہ چومتے ہیں پیشانی سے لگاتے ہیں اور پھر اسی بکس میں بحفاظت تمام رکھ چھوڑتے ہیں۔

اور مُنّے کی امّاں اپنا یہ توصیفی سکالرشپ کر اس طرح مسکرائیں جیسے کوئی ادیب اپنا شاہکار داد پا کر مسکرا رہا ہو۔

ابھی یہ بات چل ہی رہی تھی کہ دروازہ پر کوئی جانی پہچانی سی دستک پڑی۔

اور میں نے مُنّے سے کہا۔

ذرا دیکھنا بیٹا کون ہے ـــــ اور وہ دروازے سے اپنے مخصوص انداز میں چلّاتا ہوا آیا ـــــ

ابا۔ ابا۔ نسائی (قصائی) آ گیا۔

میں نے کہا۔ چپ بے۔ اس سے کہہ دے گھر پر نہیں ہیں۔

اور پھر اسی طرح بہت سے قرض خواہ صبح سے شام تک زنجیر تو بجاتے رہے پر چکّر لگاتے رہے۔ اور میرا دماغ بھی جیسے چکرا کر رہ گیا۔ پہروں سوچتا رہا ـــــ

"شیروانی تو بن گئی بابو جی! مگر ان قرض خواہوں کا کیا ہوگا؟" اور یہ سوچتے ہی مجھے مُنّے کی امّاں پر غصّہ آ گیا۔ اور یہ محسوس ہوا جیسے انھوں نے کوئی خوبصورت سازشی جال بچھا کر مجھے اس میں پھانس دیا ہو۔ جی چاہا کہ ان کی بنوائی ہوئی شیروانی انھیں کے منہ پر دے ماروں لیکن پھر خیال آیا کہ انھوں نے صرف مشورہ ہی تو دیا تھا۔ وہ ایسا ہی مشورہ دے سکتی ہیں لیکن میں نے اپنی ناسمجھی سے اس پر عمل کیا۔ اصل مجرم میں ہوں وہ نہیں۔

پھر ـــــ پھر ـــــ اور یہ مجھے اپنے اوپر بھی غصّہ آ رہا تھا۔

دوسرے دن بازار جاتے ہوئے ایک قرض خواہ نے کہا ـــــ "بابو جی! چار پیسے" ـــــ اور میں اتنا سنتے ہی زمین پر اس طرح گڑ کر رہ گیا۔ جیسے سچ مچ کسی نے کالی شیروانی کا پلّہ پکڑ کر تھام لیا ہو۔

اُف! یہ کالی شیروانی ـــــ قرض کی کالی ناگن ـــــ

جوانی کا آخری دن

محمود فاروقی

جوانی کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم؟ اس کا کچھ تعین کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن احساسات اور جذبات کی کروٹیں جوانی کے آغاز اور اس کے انجام کو موہوم نقطوں کی طرح ضرور نشان زد کر دیتی ہیں۔

چنانچہ اس نے بھی گرمیوں کی اس سنسان دوپہر میں پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی جوانی ختم ہو رہی ہے۔

اس وقت وہ شہر سے دور ایک چھوٹے سے مضافاتی ہسپتال میں علاج کی خاطر آیا ہوا تھا۔ آج اسکے داخلے کا پہلا دن تھا اور ابھی تک ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے اس کی گھناؤنی بیماریوں کا معائنہ نہیں کیا تھا۔ ایسی بیماریاں جو نہ صرف اس کے جسم بلکہ اس کی تمام جوان تمناؤں اور آرزوؤں کو بھی شکار کر چکی تھیں۔

ہسپتال کے باہر دور دور تک پھیلے ہوئے میدان اور خزاں رسیدہ پیڑوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس سارے ویران منظر میں دور بہتی ہوئی ایک چھوٹی سی ندی اور چند آم کے درخت فرحت اور تازگی کا واحد سبب تھے —— وہ ہسپتال کے ایک برآمدے میں کھڑا ہوا اس سنسان منظر کو دیکھ رہا تھا اس کی نظریں گوندنی کے ایک خزاں رسیدہ بوڑھے پیڑ کے سایہ پر لگی ہوئی تھیں جو عین دوپہر میں جھکتے ہوئے سورج کے ساتھ مشرق جانب آہستہ آہستہ کھسک رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس سرکتے ہوئے سایہ کے ساتھ اس کی جوانی کی بچی کھچی پونجی اور اس کے جسم کی رہی سہی توانائیاں دل میں ٹھہرے ہوئے ولولے ذہن میں رکے ہوئے حسین خواب اور مستقبل کی جگمگاتی ہوئی تمام آرزوئیں اس کو تنہا چھوڑ کر کسی نامعلوم منزل کی طرف بھاگی چلی جا رہی ہیں۔ اس سنسان دوپہر میں اس نے محسوس کیا کہ وہ اسکی جوانی کا آخری دن اور وہ لمحہ اس کے شباب کا آخری لمحہ ہے جسے گوندنی کا منحوس سایہ اپنے تاریک آغوش میں دبائے بھاگا جا رہا ہے۔

اس انوکھے اور تکلیف دہ احساس کے ساتھ اس کا دل بری طرح بھر آیا اس کی آنکھیں حسرت و یاس سے ڈبڈبا گئیں۔ اس تکلیف دہ خیال سے بچنے کے لئے اس نے اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ آم کا ایک درخت ہرے ہرے پتوں اور سفید سفید بور سے لدا کھڑا تھا۔ اسے آم کی کنواری کونپلوں کو دیکھتے ہوئے بڑی تسکین سی ہوئی —— اسے وہ دن یاد آیا جبکہ وہ اس آم کے بور بھرے پیڑ کی طرح جوان ہونے لگا تھا وہ بارش کی ایک خوشگوار صبح تھی جب کہ اسے اپنے نوجوان ہونے کا پہلا احساس ہوا تھا —— اس دن صبح وہ بہت جلد اٹھ گیا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس دلفریب منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ کھلے دریچہ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ ایک بے آستین کی نیلی بنیان اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اس نے دریچہ کے کٹہرے پر دونوں ہاتھ ٹیک دیئے تو اس کے مضبوط اور طاقتور بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آئیں اور اس نے ایک عجیب و غریب طاقت کو اپنے جسم میں مچلتے ہوئے محسوس کیا۔ اور ایک احساس برتری کے ساتھ اپنی نظریں سامنے پھیلے ہوئے میدان پر ڈالیں —— لیکن برگد کے تناور درخت بہتا ہوا نہر کا تیز دھارا... بادلوں میں گھرے ہوئے سیاہ پہاڑ سب کے سب اسے حقیر نظر آئے۔ اس کے دل میں نت نئے ہنگامے اور ولولے مچلنے لگے اس کی طبیعت چاہ رہی تھی کہ وہ کائنات کی ان ساری بڑی بڑی چیزوں کو اپنی مٹھیوں میں پکڑ کر بھینچ دے —— یقیناً وہ اس کی جوانی کا پہلا خوشگوار دن تھا۔

اسے یاد آیا کہ وہ تھوڑی دیر بعد ہی نیچے اتر آیا تھا۔ تاکہ ہوسٹل کی نچلی منزل سے اپنے دوست ارشاد کو ساتھ لیکر تالاب میں نہانے کے لئے جائے۔ جب وہ نیچے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ خود ارشاد تیرنے کے لباس پہنے اس کی طرف آ رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اور ارشاد تالاب کی طرف دوڑ رہے تھے بارش کی ہلکی ہلکی پھوار ان کے جوانی سے تمتمائے ہوئے دلکش چہروں پر نثار ہو رہی تھی۔ وہ ایک استوار رفتار کے ساتھ چھوٹی سی پگڈنڈی پر دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ اور ان کے سانس سے بھرے ہوئے سینوں میں ان گنت تمنائیں رقص کر رہی تھیں۔

کی جوانی کو گھن کی طرح کھا گئی تھیں۔ اس کی نظر برآمدہ کے باہر پڑی۔ گوندنی کا پیڑ پھیلتے ہوئے منڈیر تک پہنچ گیا تھا۔ اور وہ دوسری طرف آم کے پیڑ پر کوئل کوک رہی تھی۔ آہ کتنا فرق ہے۔ ان دونوں درختوں میں بالکل اتنا ہی جتنا اسکے اور ارشاد کے راستہ میں تھا۔

ارشاد ڈاکٹر بنکر معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ بن سکا بجز ایک شاعر کے اس نے اپنی جوانی کے ۲۰ سال بس یونہی ضائع کر دیئے۔ ان گذرے ہوئے بیس سالوں کی ایک ایک تفصیل آج جبکہ گوندنی کا منحوس سایہ اس کی جوانی کو اپنے لپیٹ میں لئے ہوئے بھاگ رہا تھا اسکے دل پر زہریلے ڈنک کی طرح کھٹک رہی تھی اسے متعدد آوارہ دوستوں کے مسخ چہرے اور گھناؤنی عورتوں کے آلودہ جسم گندے قحبہ خانے پرشور شراب خانے ایک ایک کرکے یاد آگئے۔ اسکو اپنی وہ گیتیں اور نظمیں بھی یاد آئیں جنکو لوگ ادب کے ارتقائی نمونے کہا کرتے تھے۔ اور وہ بھی اپنی ان تخلیقات پر بڑا ناز کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اسے اپنی ان تخلیقات پر بڑی ندامت سی محسوس ہو رہی تھی۔ سب نے لکھا ہی کیا تھا بجز بھوک کے قصے جنس کی بھوک ذہنی بھوک —— بھوک کے اس خیال پر اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت دیر سے بھوکا ہے۔ اور بھوک بڑی تیزی سے اس کے حواس پر چھائی جا رہی تھی۔ بھوک، بھوک وہ بڑبڑانے لگا۔ کمبخت بھوک آخر کبھی ختم بھی ہوگی لیکن اسے فوراً ہی یہ محسوس ہوا اس کو، یہ بھوک اس کی معدہ اور نفس کی بھوک سے بالکل ہی مختلف ہے۔ انوکھی ہے جسے وہ اپنی گذشتہ زندگی میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ مٹا رہا ہے۔ نہ تو اسے اس وقت اپنا معدہ بھرنے کی ضرورت معلوم ہو رہی تھی اور نہ ہی اس کا نفس بھوکا تھا۔ ان دونوں کی بھوک تو جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے بالکل ہی نئی اور انوکھی قسم کی بھوک لگ رہی تھی۔ نفس اور معدہ کے بجائے اس کے جسم میں کوئی نہ معلوم شے غذا کا مطالبہ کر رہی تھی۔ یہ کیسی بھوک ہے؟ وہ ہسپتال کی کوچ پر لیٹا ہوا بڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اسے یاد آیا کہ بھوک کے موضوع پر ارشاد سے اس کی ایک دلچسپ گفتگو ہوئی تھی۔

ارشاد سے اسکی یہ ملاقات کسی سفر میں ہوئی تھی۔ بہت دنوں کی جدائی کے بعد وہ دونوں ایک اسٹیشن کے کیفے میں مل گئے تھے۔ ارشاد کسی بلیک زدہ مقام پر ریلیف کے لئے جا رہا تھا۔ اور وہ ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے۔ اسی وقت اس نے ارشاد کو مشاعرہ میں پڑھا جانے والا اپنا ایک گیت سنایا تھا۔ اس گیت کا عنوان تھا "میں بھوکا ہوں" اور اس میں اس نے کچھ اس قسم کے خیالات پیش کئے تھے۔

میں بھوکا ہوں...... میرا جسم بھوکا ہے۔
پھر یہ لوگ آخر اپنی خوابگاہوں پر موٹے موٹے پردے کیوں ڈال دیتے ہیں۔
اور اپنے باورچی خانوں کو کس لئے مقفل کر دیتے ہیں۔
مجھے اپنے جسم کی بھوک مٹانا ہوگی۔
چاہے خدا کتنا ہی خفا کیوں نہ ہو۔
مگر خدا کو اس سے کیا۔
وہ تو سو رہا ہے —— ایک میٹھی نیند۔
اسے کیا خبر دنیا بھر کے بھوکے جسموں اور دلوں کی۔
آؤ بھوک کے مارو آؤ۔
آؤ ہم باورچی خانوں کے دروازے توڑیں۔
اور خوابگاہوں کے پردوں کو پھاڑیں۔
وہاں ہم کو روٹی ملیگی اور منتظر مچلتے ہوئے جسم بھی۔
جنہیں آنچ لو دیتی ہے جنہیں آرزوئیں تھما دیتی ہیں۔

ارشاد اس نظم کو سنکر بڑی دیر تک خاموش رہا جیسے اسکو خدا کے سو جانے کا سخت افسوس ہوا ہو۔ کچھ دیر بعد ارشاد نے اسکی طرف سموسوں سے بھری ہوئی پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور خوابگاہوں اور باورچی خانوں کے دروازے توڑتے ہوئے اپنے دل کے بند دروازوں کو بھول نہ جانا۔ کبھی تمہارے دل کے دروازے کھلیں تو تم کو معلوم ہو کہ تمہاری روح تمہارے جسم سے کہیں زیادہ بھوکی ہے۔"

لیکن وہ ان گزرے ہوئے ۲۰ سالوں میں صرف باورچی خانوں اور خوابگاہوں میں ہی نقب لگاتا رہا تھا۔ اس نے کبھی بھی اپنے دل کے بند دروازوں کو کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر آج جبکہ اس نے غذاؤں کو نہیں بلکہ غذاؤں نے اسے ہضم کر لیا تھا۔ اور گوندنی کا تاریک سایہ اسکی بچی کھچی جوانی کو ہضم کرنے کے لئے آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا اسے محسوس ہوا کہ اسکے دل کے دروازے چوپٹ کھل چکے ہیں۔ اور ایک نئی طرح کی عجیب و غریب بھوک لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے۔

نئی بھوک شدید ہوتی چلی گئی اور وہ اسکے تمام اعصاب پر بری طرح چھا گئی۔ واقعی ارشاد نے سچ کہا تھا کہ اسکی روح اس کے جسم سے زیادہ بھوکی ہے۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۴۳)

فضل من اللہ

کٹی ہوئی جیب

رات بڑی ہی خوشگوار تھی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، آسمان کی نیلاہٹ بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ نیلے آسمان میں ستارے یوں لگتے تھے جیسے کسی معصوم بچی کی نیلی چنریا میں موتی ٹکے ہوئے ہوں۔ فضا میں خنکی تھی۔ دلنواز خنکی —— اور خوشبو بھی! مدھم مدھم، میٹھی میٹھی خوشبو جو میں جیل تفریح کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ میں سیر سے پوری طرح لطف اندوز ہوا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دن تو در اصل یہی ہوتے ہیں باقی جو سارا سال کچھ اس کی یاد اور کچھ انتظار میں کٹ جاتا ہے۔

فیروز پور روڈ سے اچھرہ جانے کے لئے اچھرہ روڈ پر مڑیں تو سیدھے ہاتھ ایک کوٹھی کی لمبی دیوار دور تک چلی جاتی ہے یہ کوٹھی لالہ سوایا رام نے بنوائی تھی اس دیوار کے قریب سے ہوتا ہوا بیری کا ایک پیڑ بھی ہے جو سڑک پر جھک گیا ہے جب میں اس پیڑ کے قریب پہنچا تو پھولوں سے لدے ہوئے پیڑ نے خوشبو کو میرے قدم لینے بھیجا اور میں نے ایک روحانی سرور محسوس کیا —— ایک ناقابل بیان روحانی سرور!

اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شیشہ ٹوٹا ہے اور آواز رسا پیدا ہوئی ہے اُف! کتنی دلدوز چیخ تھی وہ! میں نے چاروں طرف دیکھا میرے کانوں کو بہ حسرت متوجہ رکھنے کی کوشش کی مگر میں کچھ نہ سن سکا نہ دیکھ سکا۔ میں نے اس کو وہم سمجھ کر ذہن سے نکال دیا اور ابھی ایک قدم چلا ہی تھا کہ وہی سسکی ایک بار پھر میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ کراہ میرے پاؤں کے قریب کہیں سے سنائی دی ہے میں نے جوتوں پر نظر ڈالی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا سوائے ایک چیتھڑے کے۔ یہ چیتھڑا کچھ جوتے کی ٹو پر پڑا تھا اور باقی جوتے کے تلے تھا۔ میں نے جھک کر اُسے اٹھا لیا۔

یہ ایک کٹی ہوئی جیب تھی!

یہ کٹی ہوئی جیب ابھی سسک رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ یہ چاندنی رات۔ یہ رومانی موسم اور کٹی ہوئی جیب —— جیسے کوئی نعت تو ہو، حضرین قہقہے ہوں، سامعین کھلکھلاتے ہوں، تذکرۂ حسن و عشق ہو اور کوئی صاحب غزل مرصع پڑھتے پڑھتے مقطع عرض کر رہے ہیں ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

"کاش! اکٹی ہوئی جیب نے میرے استعجاب کو اور بڑھنے نہ دیا اور بھرآئی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ "کاش میرا کوئی مزار ہوتا"! اس مزار کے بالین سنگِ مرمر کا ایک کتبہ ایستادہ ہوتا جس پر کوئی درد بھرا شعر کندہ کر کے کہ رونا ہے گزرنے والے سے دو ہاتھ اٹھا کر ۔ ۔ ۔ فاتحہ پڑھتے جاتا اور یوں بیاں! اجیبی ستم رسیدہ ہمدردی اور دعا کے چند کلمات سے نوازی جاتی مگر افسوس ۔ "

اجیبی! ستم رسیدہ!

اور اچانک میرے ذہن میں وہ الفاظ بھی آ گئے جو اس کتبہ میں ہو سکتے تھے۔

اجیبی!

اپنے قدموں کو روکو ذرا!

سنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستان!

"اجیبی" کٹی ہوئی جیب نے کہا "میری کہانی سنو گے!"

"کٹی ہوئی جیب کی کہانی" میں نے خود سے کہا اور پھر خود پر ہنس کر کہنے لگا "بڑی کاتم ظریفی ہے یہ قدرت —— میر تقی میر کے راستے میں کانٹے سرو کھدیا اور عزیز احمد کی ملاقات —— جبکہ چاندنی اسی طرح چھٹکی ہوئی تھی اور جیب بہر حال دساور پے ٹکی ہوئی تھی —— وزیر تاج سے کرادی —— اور میرے راستے میں ایک کٹی ہوئی جیب کہانی سنانے کے لئے بھیج دی"۔

اور پھر میں کہانی سننے اور کہانی لکھنے کے متعلق سوچنے لگا۔ کہانی لکھنا میرے لئے چنداں مشکل نہیں۔ مگر اس وقت ہر کہانی لکھنے والے کے لئے مشکل پیش آتی ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی عظیم مصنف ہو جب ایک اشکوں بھری داستان اُسے سنائی جائے اور وہ اس سے متاثر بھی اسی شدت سے ہو جس شدت سے کہ سنانے والا خود متاثر ہو ایسے عالم میں جذبات میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اور پھر افکار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا۔ اِدھر اساتذہ فن اس بات پر رہ

رہتے ہیں کر دیکھنا اگر واقعہ ہی کو افسانہ بنانا چاہو تو بخوشی ایسا کرنا مگر اس میں
اس نوعیت ضرور پیدا کر دینا یعنی جیب تک پیچ کے چہرۂ سادہ پر بناوٹ کا غازہ رنگین
نہ ملے کہ کشش پیدا نہیں ہوگی ـــــ مجھے ایک کہانی سننا بھی تھی اور لاما کا لکھنا بھی
اور میں اسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کٹی ہوئی جیب نے پھر مجسم التجا بن کر کہا ـــ

"تو میری کہانی نہیں سنو گے، کیا حرج ہے آخر اس میں؟"

"ضرور ضرور" میں نے دامنِ کشش سے بچنے کے لئے کہا۔

کٹی ہوئی جیب نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

مجھے اپنے مالک سے جدا ہوئے چند گھنٹے ہوئے ہیں وہ گوجرانوالہ کے ایک
دور کے گاؤں سے لاہور زمین کی الاٹمنٹ کے قضیے کے حل کے سلسلہ میں آیا تھا اس
قضیے سے نمٹ کر وہ اچھرہ میں اپنی بیٹی سے ملنے آیا تھا۔ اس کا لڑکا اس کے ہمراہ تھا
باپ بیٹا جب یہاں اچھرہ موڑ پر بس سے اترے تو میرے مالک نے جیب میں
ہاتھ ڈالا تاکہ کچھ پھل خرید کر لے چلے تو اس کے چہرے پر مایوسی اور خوف کی [illegible]
پرچھائیں وہاں پھیل گئی تھی۔ وہ یہ خبر بمشکل بیٹے کو سنا سکا اور بیٹے کی حالت بھی
اس سے مختلف نہ رہی۔

میں اس وقت ایک جیب کترے کے قبضہ میں تھی جو قریب ہی کا ایک دکان
پر بیٹھا سلگا رہا تھا مگر اس کی خبر کسی کو بھی نہ تھی۔ سوائے جیب کترے کے، میرے
مالک کو نہ اس سپاہی کو جو قریب ہی کھڑا تھا۔ جیب کترا خوش پوش نوجوان تھا اس
پر بھلا کون شبہ کر سکتا تھا؟

مجھ پر اس جیب تراش نے اس وقت ہاتھ صاف کیا تھا جب میرا مالک
زمین کی الاٹمنٹ کے قضیے سے فارغ ہو کر لاٹ صاحب کے دفتر سے باہر نکلا تھا اور
آدمیوں کی بھیڑ میں جس میں سوار ہوا تھا اسے بس میں جگہ حاصل کرنے کی فکر تھی۔ ہر
شخص کو ہوتی ہے ـــــ اور اسے اپنے لڑکے کا خیال بھی تو تھا اگر وہ اس سے بچھڑ
جاتا تو اس بہت بڑے بے رحم شہر میں اسے کون سنبھالتا ـــــ چنانچہ اس نے بیٹے کا
ہاتھ بھی پکڑا اور بس کا دروازہ بھی اور میری اسے فکر نہ رہی اور اس جیب کترے کا کام
بن گیا جو اس کے ساتھ ہی سوار ہوا تھا۔ اور پھر اس نے مجھے اپنی جیب میں قید
کر دیا تھا جو چھوٹی تھی، تنگ تھی اور گرم اور جس میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے
کھلی ہوا میں زندگی بسر کی تھی۔ جیب [illegible] میں مجھے رکھ دیا گیا [illegible] تھا اور اس میں
[illegible] ہوا آتی جاتی تھی۔ میرے مالک نے [illegible] گلابی [illegible] رکھی تھی جو شہر کی
[illegible] اور دیہات کی [illegible] ایک [illegible] تھی [illegible] کے دور کی
[illegible] کپڑے کی جیب [illegible] تھی۔ جیب میرا مالک [illegible] تو ہوا کے جھونکے مجھے بڑا
ہی لطف پہنچاتے۔ اور یہاں میرا دم گھٹ کر رہ گیا تھا میں پیچ رہی تھی بس کے بھی

تھی مگر اس کی خبر کسی کو بھی نہ تھی نہ جیب کترے کو نہ میرے مالک کو۔

پھر جیب کترا بیڑی سلگا کر اسی سڑک پر آیا اس نے جیب ٹٹولی، دس دس
کے پانچ نوٹ نکالے اور مجھے یہاں پھینک گیا۔"

"آہ! مجھے تم سے ..... "

میں نے دلی ہمدردی کا اظہار کرنا چاہا مگر یہ اظہار قبل از وقت تھا وہ تو قطع
سانس لینے کے لئے رکی تھی دراصل بات کہاں پوری ہوئی تھی۔

"سو تو" اس نے کچھ اسی ادا سے کہا جیسے اس نے میرا اس کا غم اپنے اندر
جذب کر لیا ہو۔

"ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے"

"تو ادھر میرا مالک جیب کاٹی سے چلا تو وہ دو سو روپے لیکر چلا۔ گاؤں
میں اس کی آٹے دال کی دکان تھی مگر زمینداروں میں سے جو محبت ہوتی ہے وہ اسے
بھلا [illegible] تھی اور اسے
زمین حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس کا اس نے بندوبست کر لیا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر
اس نے پان کھایا اور پاسنگ شو کی ایک ڈبیا اور ایک بکس دیا سلائی کا خریدا اور
ٹکٹ لے کر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے میں وہ سگریٹ پھونکتا اور مسافروں
کی عجیب و غریب باتیں سنتا رہا۔ لڑکا بھی خاموشی سے بیٹھا رہا۔ لاہور پہنچ کر وہ ایک
معمولی سے ہوٹل میں پہنچے۔ لڑکا پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا اور باپ بیٹے پر اپنی فیاضی کا سکہ
جمانا چاہتا تھا چنانچہ جب ہوٹل کے نوکر نے اس سے پوچھا "کیا لاؤں؟" تو اس نے
ترنگ میں آ کر کہا "جو مرضی چاہے لاؤ ـــ" اور دو آدمیوں کے لئے چائے مانگی۔
اور جب وہ فارغ ہوئے تو بل میں تین روپے کچھ آنے ادا کیا گیا۔ باپ تو خیر شہر یار
بن کر آیا تھا مگر بیٹے نے حیران ہو کر سوچا "بھوک کو بہلانے کے تین روپے اور کچھ آنے!"

ہوٹل سے نکلے تو تھوڑی دور گول چکر میں ایک مجمع نظر آیا۔ شوق تجسس انہیں
وہاں کشاں کشاں لے گیا۔ ایک تانگہ کی گدیوں پر ایک پیٹی میں بہت سی شیشیاں
پڑی تھیں اور ان کے پاس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ قندھاری
انار کے دانوں کی طرح، ویسے ہی چہرے والا ایک شخص سیٹ پر کھڑا لیکچر دے رہا تھا۔
لیکچر دار تقریر ختم ہو رہی تھی اور اب مقرر طاقت کی اس دوائی کے فائدے اور ترکیب
استعمال بتا رہا تھا "صاحبان ..... " مگر ابھی الفاظ کے ساتھ جب مجمع
حرکت میں نہ آیا تو اس نے پینترا بدلا ...

"صاحبان! بڑی بڑی مشینیں کام کرتے کرتے گھس جاتی ہیں تو ذرا غور
کرو کہ آدمی کا کیا حال ہوتا ہوگا جو بہرحال فولاد کا بنا ہوا نہیں۔ بھائیو ہمارا
شربت فولاد ...."

چودھری نے فقط یہی سُنا تھا اُس کے ذہن میں کھلبلی مچ گئی۔ بے کلی کے طور پر اُس کا ہاتھ جیب کی طرف گیا۔ اُس نے جیب سے سوا روپیہ نکالا اور ایک بوتل لے لی اور پھر وہی بھیڑ چال۔

اور جب بھیڑ چھٹی تو ایک نوجوان دوسرے سے کہتا جا رہا تھا۔ "چار سو بیس ہیں چرکٹے، فائدہ ہووے نہیں سالے ٹھگ ہیں ٹھگ، چار آنے کا سوا روپیہ بنا لیتے زبان کے زور پر۔"

مگر میرے مالک نے یہ ریمارک نہیں سنے اور وہ چل دیا۔

آگے چل کر ایک بازار میں آٹھ آنے کے عوض اُس نے دو انگوٹھیاں خریدیں۔ یہ طلسمی انگوٹھیاں تھیں جو دنیا کی ہر بیماری کے لئے موثر علاج کا حکم رکھنے کے علاوہ ہر طرح کی کامیابی کی کنجی بھی تھیں۔ مقرر نے اس کا ایک یک ماندہ گنجینہ پایا تھا اور کہا تھا کہ ایک بزرگ کی خدمت کر کے اس نے یہ چیز حاصل کی ہے۔ تقریر کے بعد کو چند گواہوں نے وہ قصہ کر دیا تھا جو رحمانے کہاں سے آ ٹپکے تھے اور سبھی مسکرا مسکرا کر کہتے تھے کہ طلسمی انگوٹھی کو جیسا سُنا ویسا پایا۔ دو پیسے کی انگوٹھی چونی میں چھوٹی گو ابھرو اور حرب زبانی کے بل بک گئی۔

لاہور میں ایسے طلسمات بیسیوں ہیں۔ میرے مالک کی قسمت اچھی ہوتی تو وہ تانگہ پکڑ فنانشل کمشنر کے دفتر پہنچتا مگر پیدل پھرنے میں کم جاتا اور کچھ بچ بھی رہے، کی خاطر پیدل ہی منزل مقصود تک پہنچنے کا اس نے قصد کیا۔

ایک جگہ اُس نے ایک طلسمی سرمہ خریدا جو آنکھوں کے ہر مرض کے لئے تریاق تھا اور جس کا تجربہ بوڑھے حکیم صاحب نے خلا کر کے دکھایا تھا کہ پانی کا ایک چھوٹا سا گلاس ایک سفوف پڑنے سے سرخ ہو گیا مگر سرمے کی ایک سلائی نے اسے پھر صاف کر دیا۔ میرا مالک اس معجزے سے کس طرح روگردانی کر سکتا تھا۔

چلتے چلتے وہ انار کلی پہنچ گیا اور کتابوں اور رسالوں کے ایک سٹال پر آ کر رک گیا۔ اور اُس نے ایک رسالہ اُٹھا لیا اور بیٹے سے پوچھا۔ "یہی تو ہیں نہ؟" لڑکے نے نام پڑھا اور اثبات میں جواب دیا۔ میرا مالک بس حرف شناس تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں تعلیم حاصل کرنے کا شوق حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ مگر جنہیں تعلیم کی جگہ حسرت ملتی ہے۔ میرا مالک پہلی جماعت میں تھا کہ اُسے مدرسے سے اُٹھا لیا گیا اور پھر ساری عمر وہ پڑھ نہ سکا۔ البتہ اُس کے شوق نے یہ صورت ضرور اختیار کی کہ کاغذ کا ٹکڑا اخبار وغیرہ کے ڈھیر پر بھی ملتا تو بھی اُٹھا لیتا اور عجیب عجیب شکلیں بنا کر پڑھنے والوں جیسا منہ بنانے کی کوشش کرتا۔ اسی شوق کے ہاتھوں اُسے اس رسالے سے تعارف ہوا تھا۔

نمبردار کا لڑکا اُس کے ہاں ایک دن کچھ ردی اخبار اور رسالے دے گیا۔ عادت کے مطابق جب وہ مختلف رسالوں کو دیکھتے دیکھتے اس رسالے تک جو پہنچ

رسالے کے آخر صفحے تک پہنچا تو پچاس ہزار روپے کے نقد انعام کے الفاظ پڑھ کر وہ بھونچکا رہ گیا اور دھڑکتے دل سے بیٹے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں جب وہ آیا تو اُس نے اُس سے کہا۔

"لیاقت میں ذرا یہ دیکھنا تو۔"

اور پھر لیاقت علی نے ٹھہر ٹھہر کے بتایا کہ یہ رسالہ دلی سے نکلتا ہے۔ یہ اشتہار ایک معمے کا ہے۔ پھر اُس نے معمے کی تشریح کی اور بتایا کہ اگر حل صحیح نکل آئے تو پچاس ہزار روپے انعام ملتے ہیں۔ مگر اگر یہ غلط ہو تو سوا روپیہ ڈوب جاتا ہے۔"

"[illegible]"

اُس نے یوں ایسے کہا جیسے کسی نے خسر کا نام لے لیا ہو۔

لیکن بیٹا [illegible] بہت [illegible] تھی کہ اس آخرت کی [illegible] باقی [illegible] پھر وہ خواب دیکھنے لگا۔ جوانی کل [illegible] خواب [illegible]

[illegible] اس نے [illegible] پھر وہی [illegible] اور جب ماہ پچاس ہزار چلا۔ وہی انتظار، وہی امید، اور نتیجہ [illegible] ناامیدی اور گالیاں ایک بد قسمتیں لکھی کر [illegible] کا اعلان۔

اور آج [illegible] اس رسالے نے ایک لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ میرا مالک ایک بار پھر خود فریبی کا شکار ہو گیا حقیقت پسند بننا کتنا مشکل ہے۔

پھر وہ بازار میں [illegible] اور ضرورت کی چیزیں خریدنے لگا۔ لیاقت علی کے لئے بوٹ، کوٹ کا کپڑا، [illegible] کے لئے سلیپر، [illegible] کے لئے کھلونے، بیوی کے لئے دوپٹہ۔ جب وہ بازار سے نکلا تو اُس کے پاس سوا سو روپیہ کم ہو چکا تھا۔

زمین کا قضیہ نمٹانے کے لئے اُس نے وکیل کیا اور وکیل کی فیس کے علاوہ بھی خرچ کرنے [illegible] میں سے محبت تھی اور وہ ہر قیمت پر زمین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ گورنمنٹ اُسے یہ زمین خدا واسطے نہیں دے رہی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ مشرقی پنجاب میں جو زمین وہ چھوڑ آیا ہے اُسے وہ کھو چکا ہے اور پھر بقول شخصے دل کے لڈو میں ڈھیلا گرے تو سالم کیسے برآمد ہو، اور اب وہ پیسے خرچ کرنے کے بعد مطمئن تھا کہ اُس کا کام ہو جائے گا۔ جب وہ گاؤں سے چلا تھا تو بھی یہی اطمینان لے کر چلا تھا وہ کہتا تھا کہ روپیہ سب کا بہنوئی ہوتا ہے اور سارے کام خود کرا لیتا ہے۔

اور پھر جب وہ اس قضیے سے فارغ ہو کر اپنے گاؤں آنے کے لئے بس میں سوار ہوا

میرے سر سے جاگرد دی گئی ـــــ یا تم کو معلوم ہے ہی۔

"لیکن" میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ میں پہلے جلد بازی کر کے پچھتا چکا تھا جب میں دوبارہ جلد بازی کرکے اس سے ہمدردی جتاتا تو شاید وہ پھر برہم ہو جاتی اس لئے میں نے اس سے ذرا مانوس ہونا زیادہ مناسب سمجھا ـــ اور اس لیکن کے بعد کہا۔

"لیکن تم تو بے جان کپڑے کی ایک بے جان جیب ہو تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہو جاتی ہیں؟"

"یہ نہ کہو، جتنی جان مجھ میں ہے آدمی میں کہاں؟ میں آدمی کے دکھ درد کی شریک ہوں، سردی کی شدت میں اس کے ہاتھ گرم کرتی ہوں۔ اور جب وہ مجھے نقدی سے پُر کرتا ہے تو اس کی خوشی میں اور جب مجھے خالی کر دیتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے تو اس کے غم میں شریک ہوتی ہوں، مجھے بے جان نہ کہو"

اب میں نے ڈرتے ڈرتے، جھجکتے جھجکتے ہمدردی کا اظہار کیا۔

وہ بھڑک اٹھی ـــــ

"ہمدردی؟" اس نے چیخ کر کہا، اس چیخ کی کربناکی میں صدیوں کا غم جیسے معلوم ہوتا تھا۔ "آدمی بھی عجیب ہے، تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے اور تم جیب کترے کو کوسو گے، سو گئے بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ احمق کہیں کے ....."

میں نے اسے ٹوکنا چاہا، مگر وہ بھڑک اٹھی [illegible] جیب کترے اٹھے تو عافیت اسی میں ہے کہ آرام سے مر جائیے چنانچہ میں بھی مجرموں کی طرح [illegible]

جھلائے۔ بہا ہوا اس کی چیخیں نکلنے لگیں وہ کہہ رہی تھی ـــــ

"آدمی آدمی کو لوٹتا ہے، آدمی آدمی کی جیب سو روپ بدل کر کاٹتا ہے۔ کبھی سوداگر کے بھیس میں، کبھی جعلی اور کبھی اصلی حکیم اور ڈاکٹر کے بھیس میں کبھی حکومت کے بھیس میں، کبھی سٹہ کمپنی کے مالک کے بھیس میں ـــــ سو روپ بدل کر مگر آدمی آدمی کو برا نہیں کہے گا۔ مقابلہ چند لوگوں کو جیب کترا ڈاکو، لٹیرا کہہ کر خوش ہو جائے گا۔"

"آدمی آدمی کا گوشت کھاتا ہے۔ آدمی آدمی کو پھاڑ کھاتا ہے مگر وہ اس نے گدھوں کو مردار خور اور چند جنگلی جانوروں کو درندہ کہا ہے۔ سب سے بڑا مردار خور ـــــ سب سے بڑا درندہ تو آدمی خود ہے؟"

پھر وہ قہقہے لگ[illegible] اس کے قہقہے دہر میں بجھے ہوئے تھے۔ میں پانی پانی ہوا [illegible] جلا جا رہا تھا۔ کٹی ہوئی جیب میرے [illegible] ہوئی تھی۔ [illegible] میرے ذہن میں کھو گیا تھی، موسم بڑا ہی خوشگوار تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، فضا معطر تھی ـــــ خوشگوار خنکی سے بھرپور تھی ـــــ آسمان کا نیلا رنگ بڑا ہی پیارا لگتا تھا اور پیارے نیلے آسمان میں ستارے ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی معصوم بچی کی نیلی چنریا میں موتی ٹکے ہوئے ہوں۔

جوانی کا آخری دن ـــــ بقیہ صفحہ ۳۹

باہر آم کے پیڑ پر کوئل برابر کوکے جا رہی تھی جیسے اس کی روح بھی بھوک سے بے تاب ہو کو کو ..... کو کو ..... کوئل بری طرح چیخی اور وہ بھی بے چین ہو کر پکار اٹھا میں بھوکا ہوں۔

ان کو بارلی نشاستہ دو! ایک جانی پہچانی آواز اس کے کان میں آئی۔ ڈاکٹر اس کی طرف پشت کئے ایک مریض کا معائنہ کر رہا تھا۔

وہ سمجھا بارلی کا نشاستہ اس کے لئے تجویز کیا جا رہا ہے۔ "بارلی کا نشاستہ" وہ بڑبڑایا، اسے ابکائی سی آنے لگی۔ "ڈاکٹر" وہ اپنے اضطراب پر قابو نہ پا کر چلا اٹھا۔ بارلی کا نشاستہ مجھے ..... نہیں چاہیے

ڈاکٹر، کمپونڈر اور مریض سب کے سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ لیکن وہ ان سب سے بے پروا چلائے جا رہا تھا۔

میری روح بھوکی ہے اور تم کو معلوم ہے ڈاکٹر روح [illegible] بارلی کا نشاستہ نہیں کھاتی۔ روح کی غذا بارلی کا نشاستہ نہیں بلکہ [illegible]

وہ کہتے کہتے لڑکھڑا گیا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

وہ ڈاکٹر کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ادھر آم کے پیڑ پر کوئل بھی برابر کوکے جا رہی تھی۔ "ایک ..... محبت بھری مانوس آواز اس کے کانوں میں آئی۔ میرے پاس تمہاری روح کے لئے غذا موجود ہے۔ بلاشبہ یہ ارشاد کی آواز تھی وہ چونک اٹھا "ارشاد تم ـــــ" اس نے ڈاکٹر کو حیرت سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ارشاد میرے اچھے دوست تم۔" وہ دوبارہ ڈاکٹر کے تنومند سینے سے لپٹ گیا۔

اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ڈاکٹر کے کاندھوں پر سے اس کی نمناک نظریں پھسلتی ہوئی برآمدے کے باہر گھنے نیم کے سائے پر [illegible] تھا۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سایہ سمٹتے سمٹتے اچانک غائب ہو گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کا [illegible]

بھی دھرتے معلوم پڑتے کہ ناحق میں نے ایسا کیا . . . .

" اگر وہ ڈر کر بھی مجھ سے محبت اور خلوص سے پیش آتا ہے تو اس نے میرا کیا بگاڑا جو میں اس کی جان لینے پر تلا ہوں . . . کیا میں احمد سے انتقام کی آگ بجھانے کی کوشش میں حق بجانب ہوں ؟ کس احمد نے ۔ یا احمد کی روح نے میری بہن کی بے عزتی کی ؟ کیا اسی نے میرے ضعیف باپ کی کوکھ میں چھرا گھونپ کر اس کی سرخ ، بے نور آنکھیں باہر نکال دیں . . . اف ! میں نے برا کیا ۔

" احمد تو معصوم ہے . . . " " احمد معصوم تو ہے ۔ یہ صحیح ہے لیکن میری بہن ، میرے ننھے منے بھائی یہ سب بھی تو معصوم تھے معصوم قتل کر دئے گئے ۔ معصوم پھر قتل ہوں گے . . . ذمہ داری میرے سر نہیں . . . ٹھیک ہے "۔

ابھی میری بہن کی آہوں نے پر اسرار قہقہوں میں ڈھل کر مجھے پریشان کرنا نہیں چھوڑا تھا ، ابھی میرے ضعیف باپ کی روح نے سسک سسک کر میرے سر پر منڈلانا بند نہ کیا تھا ابھی لفظ "مسلمان" میرے لئے تمام کراہتوں ، دہشتوں کا مرثیہ ہی تھا ..... "مسلمان احمد ۔ مسلمان کیسے معصوم ہو سکتا ہے . . . . وہ بھی ڈاڑھی رکھائے ہوئے ہے ۔ پورا کٹر مسلمان ہے " میرا بیمار ذہن اس سے زیادہ سوچنے کی تاب نہ لا کر سوتا میرے وجود کے ساتھ ۔

لیکن جذبات کا تھمار کا ، گھر لا پالی ۔ پورے پہاڑ سے نکلنے لگا ۔ ایک بھاری تھا طوفان بنت سے بنار کو سمیٹے رخصت ہو رہا تھا ۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب احمد اس شام کو میرے مکان پر آ پہنچا ۔ مجھے بیمار سن کر میرا حال پوچھنے ۔ وہ خوب جانتا تھا کہ میں سکھوں کے محلہ میں رہتا ہوں ۔ جہاں سب ہی رشید جی ___ دل پھینک رفیق جی ___ بستے ہیں ..... اس کی آمد پر جیسے کسی نے ایکسرے کر کے اس کے دل کو میرے سامنے رکھ دیا ۔ وہ دل جہاں نہ کوئی خوف تھا ۔ نہ کوئی حرص . . . بلکہ ہمدردی اور خلوص و محبت کے پاکیزہ جذبات تھے ۔

وہ میری علالت پر مجھے دیکھنے آیا تھا ۔ مسلمان احمد سکھوں کے محلہ میں آیا تھا . . میرے اندر کا غبار دب رہا تھا . . . غم ، غصہ اور نفرت کے بادل جو قلب کی اوپری سطح پر چھا گئے تھے ۔ اب چھٹ رہے تھے اور دل کے اندر یہاں محبت بیدار ہو رہی تھی ۔ یہ عمل جتلا رہے تھے کہ نفرت و انتقام فطری نہ تھے بلکہ یہ کاوش عائد کردہ تھے ۔ وہ دل کی گہرائیوں میں جڑ نہیں پکڑ سکے ۔ بلکہ اوپری سطح پر ایک گھٹا سی بنا دی جس سے محبت کی کرنوں کا گذر دشوار ہو گیا تھا ۔ سب اندرونی طور پر چھٹ رہے ۔ دلوں میں ہوا اور اب کوئی خلش ، کوئی چبھن باقی نہ تھی ۔ وہ رنگین عینک بھی اتر گئی جو مصنوعی تھی اور جسے جذبۂ انتقام نے میری آنکھوں پر چڑھا دیا تھا ___ اب باتیں اپنے اصلی رنگ و روپ میں نظر آنے لگی تھیں ۔ ذہن نے اس بات کے ماننے میں کوئی جھجک نہیں

محسوس کی کہ وہ مسلمان نہ تھے جنہوں نے جہلم و چناب کے کنارے انسانی خون سے ہولیاں کھیلیں اور گنگا و جمنا کی سرزمین پر دھما ڈرامہ ہندو اور سکھوں نے اپنے دھرم کے لئے نہیں کھیلا ۔ یہ سب انانیت پسند قوم پرستی کے نشے سے بدمست ہو گئے تھے ___ انہوں نے جو کچھ کیا اپنے حیوانی جذبات و خواہشات کی تسکین کے لئے کیا ۔ ایسے ہی تاثرات کی ایک باڑھ تھی جو میرے قلب میں امنڈی آ رہی تھی . . . پھر مجھے خدشات نے گھیر لیا ۔ " ظالم معصوم احمد کو موقع ملے پا کر چھوڑ نہیں سکتے ___ یہ نہیں ہو سکتا ! ہرگز نہ ہوگا ۔ میں احمد کو ضرور بچاؤں گا . . . "

وہ شام کو تو آیا ہی تھے ۔ میٹھی باتیں کرتے رات ہو چلی ۔ اس نے واپس جانے کو کہا ۔ میری آنکھوں میں شدت جذبات سے آنسو آ گئے ۔ جنہیں میں روک بھی نہ سکا ___ کتنا سکون بخش تھا وہ آنسو ۔ میں کس دل سے اسے جانے کی اجازت دیدیتا . . . میں نے اسے بتلا دیا کہ وحشی اس کی گھات میں ہیں . . . وہ کچھ گھبرایا سا نظر آیا ۔ پھر ہشاش ! جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔ شدت جذبات سے میں نے اس کے ہاتھ تھام لئے ۔

" احمد ۔ تم نے مجھ پر فتح پا لی ، بلکہ تمہاری انسانیت اور محبت نے میرے دل کو جیت لیا ۔ تم نے میرے اندرون کو بدل دیا . . . تمہاری سچائی ایمان لانے کے قابل ہے "

وہ سنجیدہ چہرہ نیچے کئے پیر کے انگوٹھے سے یونہی سخت زمین کو کرید رہا تھا ۔ اس کو بچانے کی فکر مجھے متردد کئے ہوئے تھی ۔ آخر میں نے ایک ترکیب نکال لی " احمد تم نے میرے دل کو میرے اندرون کو بدل دیا ۔ مجھے اجازت دو ___ صرف تمہیں خطرات سے بچا لینے کے لئے کہ تھوڑی دیر کے لئے تمہارے ظاہر کو بدل دوں ___ میں تمہیں سکھ بناؤں گا ___ صرف اوپر سے ، تمہیں بچانے کے لئے ___ راہ بھر کے لئے ۔ جبکہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا ۔ اپنی کمزوری کے باوجود میں ساتھ چلوں گا . . . ایک سکھ دوست بنا کر "

وہ خاموش کھڑا رہا ۔ پھر بیٹھ گیا ۔ میں نے اس کی ڈاڑھی تیل لگا کر کنگھے سے سلجھا دی . . . اس کے سر پر اپنا ایک صاف عمامہ باندھ دیا ۔ ہاتھ میں کڑا ڈال دیا . . . . . . اس ہیئت میں وہ بالکل سکھ لگ رہا تھا لیکن مجھے اس کی نئی ہیئت سے خوشی نہیں ہو رہی تھی ___ آخر کڑا ، کنگھا ، کیس ، کرپان . . . آدمی کو کیا سے کیا بنا سکتے ہیں . . . سچائی ، محبت تو کچھ اور ہی چیز ہے ___ بلکہ مجھے صدمہ ہو رہا تھا کہ کہیں احمد کی خودداری کو ٹھیس نہ لگ رہی ہو . . .

رخصت ہوتے وقت اس نے مجھ سے جو کچھ کہا وہ مجھے اب تک یاد ہے بلکہ ذہن پر نقش ہو کر مجھے روشنی دکھلاتی رہی ہیں ۔ " عظیم سچائی اور محبت و انسانیت کے مخرج کی تلاش کی ضرورت ہے "

ایک مزاحیہ رزمیہ · مثنوی

رزم نامہ

نجم الاسلام

'محبت بھی کیا چیز ہے دیکھنا' · قیامت یہ ناچیز ہے دیکھنا[1]
'ذرا بات کی چشم تر ہو گئی'!!! · نہ ہونی تھی جن کو خبر ہو گئی
کہیں قیس کو دشت دکھلا دیا · کہیں کوہ کا کوہ کٹوا دیا!!!!!
نہیں اس کے کاٹے کا کوئی علاج · گئے اس نے تاراج کتنے ہی راج
جو سر چڑھ کے بولا یہ جادو کبھی · تہ و بالا دنیا کی دنیا ہوئی
اسی سے وہ جنگیں ہوئیں خوفناک · کہ ہو دامنِ ضبط سننے سے چاک

سناؤں تمھیں بات اک روز کی · جو اک کافی ہاؤس میں واقع ہوئی
ہوا یوں کہ آتی تھی کملا یہاں · وہ دوشیزۂ ہند، شیریں زباں
گلابوں سے گالوں کے باعث جسے · دیا نام روزی کا ماں باپ نے
ہر اک باخبر حلقے کا ہے بیاں · کہ مرتے تھے سب اس پہ پیر و جواں
بہت اس کی دلی میں تشہیر تھی · اک عالم کے خوابوں کی تعبیر تھی

---

[1] ملاحظہ ہو پوپ کی مزاحیہ رزمیہ نظم "ریپ آف دی لاک" (Rape of the Lock) کا ابتدائیہ

What dire offence from am'rous causes springs,
What mighty contests rise from trivial things,

وہ امریکی شہروں میں پھیلی ہوئی — وہ سوڈکی ڈھیروں میں پھیلی ہوئی
وہ! آنکھوں کی ٹھنڈک وہ دلکا سرور — جوانی کے بدمست نشے میں چور
جوانان کالج کے قصّوں کی ہیر — کلرکوں کی اِک حسرت دل پذیر
ادیبانِ نوخیز اس کے غلام — لٹاتے تھے دل شاعرانِ کرام
بہت شور تھا اردو بازار میں — نکلتی تھی اکثر ادھر کار میں

دو کانوں پہ دانشوروں کے گروہ — کو رہتی سرِ شام روزی کی ٹوہ
کوئی فیض کے شعر پڑھتا ہوا — ترقی کے زینے پہ چڑھتا ہوا
کوئی فلم کے گیت گاتا ہوا — کوئی نظم تازہ سُناتا ہوا
ادب اور سیاست کی چالوں میں گم — لگا ہیں سڑک پر خیالوں میں گم
کوئی معتبر فکرِ چالاک پر — کوئی مفتخر طبعِ بیباک پر
دلوں میں خوشی کے لب پہ آہ و فغاں — غرض اک نئی روح سی تھی رواں

انہی نوجوانوں میں اک مرد تھا — جو الفت کے ہر کھیل میں فرد تھا
بہت ذہن چلتا تھا رومان میں — محبت کے فیضان و عرفان میں
بفضلِ خدا اس میں جرأت بھی تھی — محبت میں مرنے کی ہمّت بھی تھی
اسی سے وہ کچھ سب میں ممتاز تھا — اسے اپنی جرأت پہ خود ناز تھا
چڑھاتے تھے کہہ کر اسے شیر دل — چہکاتا تھا اکثر وہی سب کی بل
دل اس کا بھی روزی پہ مائل ہوا — کیوپڈ کے تیروں سے گھائل ہوا
خیالی پلاؤ پکانے لگا — تعاقب میں پاؤں اٹھانے لگا
نئی دلّی تک دوڑ ہونے لگی — محبّت کی دُھن عقل کھونے لگی

پھر اک روز ایسا خدا نے کیا — مرادوں کو پہونچا وہ مردِ خدا
ملاقات کیفے میں ہو ہی گئی! — پریشانیاں دل سے دھوئی گئیں

شریفانہ باہم تعارف ہوا در گفتگو دونوں جانب کھلا

بہت خاکساری دکھائی گئی لوائے سے کافی منگائی گئی!

کبھی بات موسم کی ہونے لگی تو لفظوں کی بارش سی ہونے لگی

کبھی فلم انگریزی پر تبصرے کبھی یوتھ کن ٹیسٹ[۱] تذکرے

کبھی شکسپیر اور ملٹن کی بات کبھی جارجٹ اور ساتن کی بات

الیوجی[۲] کبھی حسنِ پوشاک کی کبھی اپنے پاپا کے املاک کی

غرض گفتگو یوں ہی چلتی رہی محبت زبانوں میں پلتی رہی

اثر اپنا کافی[۳] دکھانے لگی سیاست کے نکتے سجھانے لگی

بُرا اس نگوڑی سیاست کا ہو گئی بیچ جو تلخ کامی کا بو

اِدھر عشق کٹر ترقی پسند اُدھر حسن سرمائے میں مست مند

اِدھر عشق کی روسیت جوش پہ اُدھر طرزِ جمہوریت جوش پہ

اِدھر اشتراکی خیالوں کا زور اُدھر خاص امریکی چالوں کا شور

صدائیں بلندی پہ جانے لگیں ترقی پسندی دکھانے لگیں

دلائل کے انبار ہونے لگے لڑائی کے آثار ہونے لگے

اُٹھے چھوڑ کر لوگ میز و ساغر و جام ہوئے جمع آ آ کے سب خاص و عام

سٹائر[۴] کا ایکسچینج[۵] ہونے لگا!! ایمونیشن[۶]، اے رینج[۷] ہونے لگا

۱۔ youth contest "مقابلہ حسن و شباب" ۲۔ Eulogy مدح سرائی

۳۔ Coffee (which makes politician wise,
And see through all things with his half shut eyes)
"POPE" [The Rape of the lock]

۴۔ Satire طنز ۵۔ exchange تبادلہ ۶۔ Ammunition گولہ بارود ۷۔ Arrange منظم

یہ انداز میڈم ہوا دکھاتی ہو کیوں — مجھے دھونس دیکر ڈراتی ہو کیوں
نہیں کیا فقط اک زمانے میں ہو — جو مشغول یوں آزمانے میں ہو"

"کوئی نوج ایسا بھی عاشق ہوا — الجھتا ہے یہ عورتوں سے مُوا
جوانی کے یہ زور یارب گھٹیں — ٹھہر مردوے! تیری مونچھیں کٹیں"

غرض ایک گھمسان کا رن پڑا — بڑا سخت ہنگامہ برپا ہوا
کوئی شیر دل کو بچانے لگا — کوئی رونی کا دل بڑھانے لگا
پوٹیٹو[1] کے ویفر[2] برسنے لگے — بم ایٹم کے کانوں میں بجنے لگے
ہر اک سمت کانچ بکھرنے لگی — محبت بلا موت مرنے لگی
پیالی کے گولے سے پٹنے لگے — جیالے جواں دور ہٹنے لگے
کسی ذی نے ہاتھوں میں سوسر[3] کی شیلڈ[4] — کسی کو بچی چھوڑتے وار فیلڈ[5]

پڑی ہے جو پھر چاکلیٹوں کی مار — دیا نشۂ عشق سب کا اُتار
ٹرے ایش کی[6] سر پہ توڑی گئی — "ٹیر گیس"[7] اس طرح چھوڑی گئی
ارے لو وہ کم بیٹ[8] ہونے لگا — لڑائی میں رنگ آ گیا ناچ کا
چلے بے تکلف وہ نینوں کے بان — نئے ہند کے وار مینوں[9] کے بان
ٹرے کپ کے چمچ کے قبضوں تک ہاتھ — کسی نے دی دشمن کو جوتوں کی لات
کہیں تیر سگرٹ کے چھوڑے گئے — پھپھولے جلے دل کے پھوڑے گئے

---

[1] Potato آلو [2] Wafer ورق [3] Saucer تشتری [4] Shield ڈھال
[5] War field میدانِ جنگ [6] Ash tray خاکدان
[7] Tear gas اشک آور گیس [8] Combat دست بدست مقابلہ [9] Warmen جنگ باز

ہوائیں وہ بازو دلتر گنے لگے　　وہ مژگاں کے خنجر چمکنے لگے
عجب گرم بازار مستی ہوا　　گراں سخت سودائے ہستی ہوا
چھڑا ہر طرف آہ و نالہ کا راگ　　اُجڑنے لگے ہونے والے سہاگ

بہت امنِ عالم کو خطرہ ہوا　　کہ اک کوریا اور پیدا ہوا
گئے بھاگے ڈیٹر[1] منیجر کے پاس　　منیجر کے غائب ہوئے سب حواس
کیا فون عجلت میں یو این او[2] کو　　کہ حل اس کا شاید یو این او پہ ہو
خبر اس کی اخبار کو لگ گئی　　جہاں سے پھر اغیار کو لگ گئی
چلے سب کے دیکھیں تماشا ہو نیا　　تماشا پھر اس پر تماشا نیا

حکومت کو بھی سخت تشویش تھی　　"یہ ہے داخلی جنگ یا خارجی"
نوعیت تھی پیچیدہ کچھ اس قدر　　پہونچتی تھی دشوار تر تک نظر
ابھی فیصلہ کرنے پائے نہ تھے　　اُڑان ایک بھی بھرنے پائی نہ تھی
کسی نے خبر دی کہ لو آ گئے　　نمائندے یو این[3] کے بھیجے ہوئے

سناؤں تمہیں انکے حالات بھی　　مناسب ہے ہو جائے یہ بات بھی
وہ ارباب خوش فکر عالی مقام　　فراست کا جنکی زمانے میں نام
فلاطون بھی جن کو سجدہ کرے　　ارسطو بھی جن کی سمجھ پہ مرے
لسانی طلاقت میں مانے ہوئے　　زبانی رفاقت میں مانے ہوئے
سیاسی مسائل میں وہ سوجھ بوجھ　　کہ جھکتے سب نشینانِ بامِ عر[illegible]
جو ہانڈی کا چاہے گھر میں شکار　　مگر دوسرے ملک میں نہیں[illegible]
جو دکھ درد میں خلق کے پیش پیش　　لبوں پر تشکر آستینوں میں نیـ[illegible]

۱؎ Waiter .. خدمت گار　　۲؎ U.N.O مجلس اقوام متحدہ　　۳؎ U.N.

کوئی رُوس کا سچا خدمت گذار ۔ کسی پر یو ایس اے[1] کا فینٹم[2] سوار

حکومت کو کیا کم تھے پہلے ہی کام ۔ بچاری کو تھا چین لینا حرام
جدھر دیکھو اخبار رکھے ہوئے ۔ پلانوں کے انبار رکھے ہوئے
کسی شے کا ٹائم نہ کوئی مقام ۔ فقط کام سے دُھن کہ پورا ہو کام
کبھی باگ کوچین[3] کی تمنا ۔ کمونسٹوں کے زور کا سامنا
کبھی چین کی اُلجھنوں کا خیال ۔ لڑائی کا احساس، فکرِ مآل
کبھی غور و حالات کے موڑ پر ۔ کبھی پاک امریکی گٹھ جوڑ پر
کبھی ایشیا کو جگانے کی دُھن! ۔ کبھی دشمنوں سے بچاؤ کی دُھن
وہ ادگھاٹنوں[5] کے جھمیلے کہ بس ۔ وہ جلسوں کے ریلے کہ ڈھیلا ہو کس
وہ کاغذ کے گھوڑوں کی ہر سمت ریس[6] ۔ نظر آتے سوتے میں بھی جن کے فیس[7]
اِدھر عمر بھی غم تا حدِ نگاہ ۔ اُدھر تھکتی جانیں! خدا کی پناہ
نہ کھانے کی فرصت نہ پینے کا ہوش ۔ نہ مرنے کی مہلت نہ جینے کا ہوش

مزید اب غم میزبانی ہوا ۔ ریسپشن[8] کیا، چائے پانی ہوا
کہا چار و ناچار خوش آمدید ۔ یہ دن ہے ہمارے لیے روزِ عید
زہے آمدِ صاحبانِ شرف ۔ توجہ کریں آدمی کی طرف
عجب کیا کریں عقدۂ دل کُھلے ۔ رکاوٹ جو ہے آج حائل کُھلے

بچھایا گیا ہر طرف دام سخت ۔ سجایا گیا چودھراہٹ کا تخت
بٹھائے گئے اس پہ مہماں تمام ۔ بصد شان و شوکت بصد اہتمام

---

۱ U.S.A ۲ امریکہ Phantom ۳ بھوت Coochin ۴ ٹراونکور چین دجنوبی ہند کا ایک علاقہ
۵ افتتاحی تقریبات ۶ دوڑ Race ۷ چہرہ Face ۸ Reception استقبال

پے مشورت مجلس آراستند — نشستند و گفتند و برخاستند
کوئی آبزرور[1] بنایا گیا — کسی کو صدر میں بٹھایا گیا
طبیعت تو ہر روز بیکل رہی — مگر خاصی اس روز ہل چل رہی

وسائل تھے کم اور حالات سخت — پھنسا تھا مصیبت کی عجوں میں سخت
کسی کی سمجھ کام دیتی نہ تھی — گرہ کھلنے کا نام لیتی نہ تھی
بہت آ رہے تھے بھیانک خیال — بُرا جنگ کے ڈر سے تھا سب کا حال

الٰہی میں صدقے تری شان کو — جو لے کام نادان انسان سے
تری قدرتوں کا ٹھکانا نہیں — کسی نے ترا بھید جانا نہیں
جسے چاہے تو کیوں نہ ہو سرفراز — نہیں کیوں نہ ناداں دانائے راز
نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار — تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار

اٹھا شخص اک ایسے حالات میں — کہ تھا ایک ہی سلسلے حضرات میں
مخاطب ہوا اہلِ مجلس سے یوں — "اجازت اگر ہو تو میں کچھ کہوں
اہنسا پہ باپو جی عامل رہے — سدا قول میں اپنے کامل رہے
یہی راہ اک امنِ عالم کی ہے — یہی راہ ایک ربطِ باہم کی ہے
اگر جنگ جو اپنے ہتھیار لیں — اور ان کو سمندر میں جا پھینک دیں
تو یوں صورتِ امنِ عالم کھلے — کہ در جیسے کھلتے ہی گُم سُم کھلے"

نہایت ہی معقول تجویز تھی — جو بے چوں چرا سب نے منظور کی
مگر پھر عمل کا جو آیا سوال!! — تو سب ہوش اڑ گئے بھول [illegible] چال
بالآخر لگی ہونے پھر سے سپیچ[2] — یہ سوچا گیا اہلِ دانش کے بیچ

۱؎ نگراں observer ۲؎ تقریر speech

سیاست میں ہے آج نازک وہ موڑ — کہ موسیقی ہے صرف ایٹم کا توڑ

بلائے گئے نامور اہلِ فن!! — بڑے خوش گلو اور نازک بدن

خیال اور دھرپد کے مشاق سب — یہاں تک کہ دیپک میں بھی طاق سب

الاپوں کے سب دیس چھائے ہوئے — زمانے میں استاد مانے ہوئے

ستاروں پہ تانیں اڑاتے ہوئے — محبت کے نغمے سناتے ہوئے

پئے صلح نکلے کچھ اس شان سے — کہ سنتے ہی جائے ہر اک جان سے

وہ نغمہ محبت کا گایا گیا! — فن اتنی بلندی پہ لایا گیا

کہ اک بیخودی سب پہ چھانے لگی — لڑائی کی باتیں بھلانے لگی

فضاؤں سے نشے برسنے لگے — خیالات پھولوں میں بسنے لگے

رہا کوئی دانتوں میں انگلی کو داب — کہ جیسے نظر آئے تصویرِ خواب

کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا گھڑی کی گھڑی

عجب عالمِ کیف پیدا ہوا — لبوں پر تبسم ہویدا ہوا!!

ہوئے خوش فریقین ذی شان سب — کیا ایک "ناجنگ" اعلان تب

گئی پٹ خلیج اختلافات کی — گھٹائیں چھٹیں ساری آفات کی

خدا سارے عالم کو یہ دن دکھائے

ہر آغازِ بد، نیک انجام پائے

خیال اپنا اپنا

مثنوی سرودِ بیخودی

مصنف۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور
ملنے کا پتہ: ڈاکٹر عشرت حسن انور۔ ۴ حالی روڈ۔ علی گڑھ
قیمت: دو روپے، ضخامت ۱۲ صفحات، مجلد۔ سفید کاغذ

صاحبِ سرودِ نغمات نے اس مرتبہ ایک فارسی تصنیف پیش کی ہے۔ جس میں بیخودی کے موضوع پر ایک مثنوی اور چند غزلیات شامل ہیں۔

فلسفہ بیخودی کی موافقت جو اس مثنوی میں نہایت شد و مد کے ساتھ کی گئی ہے مصنف نے کن تاثرات کے تحت اور کن مقاصد کے پیشِ نظر کی ہے۔ اسکی وضاحت کے لئے ہم کتاب کے دیباچہ میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

(۱) "یہ مثنوی اقبالؒ کے فلسفہ خودی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مقصود اس کا کسی طرح بیانِ طبیعت نہیں بلکہ گذشتہ احوال واقعی کے طور پر یہ ماجرا ہے۔"

(۲) "اس سے اگر آیندہ کے لئے آیندہ آنے والوں اور کام کرنے والوں کی کوشش سے ایک نئے طرزِ فکر کی بنیاد پڑ سکے تو میں اس محنت کو محنت بے ما ندہ۔ سمجھوں گا۔ اور لذت و تسام پر بھی لذت احسان مندی محسوس کروں گا۔"

خوشی کی بات ہے کہ مصنف نے دیباچہ کی پہلی سطر ہی میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو نظریۂ اقبال کی کلی نفی کرنے سے پیدا ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ مثنوی گذارش احوالِ واقعی کے طور پر لکھی گئی ہے۔ پھر آگے وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مثنوی سے ایک نئے طرزِ فکر کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ اس سے یقیناً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ موضوع حسنِ طبیعت کی جولانیاں دکھلانے کے لئے نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے حصول کے لئے چھیڑا گیا ہے لیکن فلسفۂ بیخودی کوئی نیا فلسفہ نہیں اور نہ اس پر ایک نئے طرزِ فکر کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ اس لئے کہ رومی سے لیکر اقبال تک اسی فلسفہ بیخودی کی گونج سنائی دیتی رہی ہے۔ یہ اقبال تھا جس نے اس عالم میں بیخودی کے فلسفہ کو لیکر اس کا اولیں تصور مغرب سے پیش کیا تھا) ایک نئی ادا پیدا کی۔ اور اس سے مُردہ دلوں میں زندگی کا نیا جوش دوڑایا خودی کا یہ پہلو خود ڈاکٹر صاحب کو بھی تسلیم ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں۔ "اور یہ حقیقت ہے کہ خودی کا فلسفہ زندگی کی گرمی پیدا کرنے کے لئے از بس ضروری ہے

ہی لیکن پھر بھی زندگی کے لئے خودی ہی عین مقصود نہیں اور نہ ہونا چاہیئے۔"

اس صورت میں دو سوال اٹھتے ہیں۔ ممکن ہے مصنف ان کا جواب بہتر طریقے پر دے سکیں۔ ایک تو یہ کہ جب خودی کا فلسفہ زندگی کا ایک جزو ہے۔ (جزو لازم نہ سہی بقولِ مصنف) تو اس جزو کا مقام آپ کے پیش کردہ (یا دوسرے لوگوں کے پیش کردہ) فلسفۂ بیخودی میں کیا مقام رکھتا ہے۔ کیا فلسفۂ بیخودی کے مطابق زندگی کو نئے خون اور گرمی کی ضرورت نہیں؟

دوسری بات یہ کہ ایسی صورت میں جبکہ بیخودی کا فلسفہ پہلے سے چلتا ہی رہا ہے اور خود آپ کی مثنوی میں "بیخودی" کا کوئی ایسا نیا تصور موجود نہیں ہے جو دوسرے لوگوں کے تصور سے مختلف ہو۔ تو پھر وہ کون سی بنیاد رہ جاتی ہے جس پر ایک نئے طرزِ فکر کی تعمیر ہو سکتی ہے۔

ضرورت ہے کہ اس کی تشریح مصنف خود اپنے قلم سے کریں تاکہ "سرودِ بیخودی" کو ایک پرانا راگ سمجھ کر ادبی دنیا یونہی نہ گذر جائے۔

اگر فلسفۂ بیخودی کا کوئی پوشیدہ پہلو ہمارے آج کے حالات میں کامیاب ثابت ہو سکتا ہے تو یقیناً اس کی وضاحت ضروری ہے تاکہ لوگ اس سے تفصیلی طور سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

مثنوی کے دیباچہ میں بھی مصنف نے اپنے نظریہ کی وضاحت کی ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ وضاحت ناکافی ہے۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ مثنوی میں بیخودی کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ کہیں دیباچہ میں پیش کردہ تصورات سے ہم آہنگ نظر نہیں آتا۔

دیباچہ میں ڈاکٹر صاحب خودی کو زندگی کی گرمی کا سبب تسلیم کرتے ہیں مگر خود مثنوی میں اسے عشق کی ایک زوال آمادہ صورت کہتے ہیں۔ "خودی و بیخودی ہر دو از احوالِ عشق اند و لے خودی در حالتِ نزول پیدا میشود۔"

عشق را ہرگز نہ احوالِ خودی است
عشق افسردہ بہ احوالِ خودی است

آگے چل کر وہ کہتے ہیں۔ ع ——— بیخودی باید برائے بیخودی

لیکن دیباچہ میں وہ بیخودی کے تصور کو عین اسلامی تصور کہہ کر اسلام کے حرکی پہلو پر اپنے تجزیاتی رجحانات پیش کرتے ہیں۔ گویا وہ خودی و بیخودی برائے معبودیت الٰہی

صحیح تشریح اقبال کے رموز میں ملتی ہے۔ بہر حال ڈاکٹر انور صاحب اقبال کے اس تصور کو نامکمل کہتے ہیں تاآنکہ بیخودی برائے بیخودی رہ جائے۔ آخر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ اسلام بیخودی کا برائے بیخودی کی تلقین کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب "تیر ما و تو" کی صفتوں کو خاص طور سے نظر میں رکھتے ہیں۔ اس ترکیب کا استعمال ان کے یہاں کئی جگہوں پر ملتا ہے۔ لیکن "تیر ما و تو" اور خودی کے اس تصور میں جو فلسفے میں بلکہ اقبال پیش کرتا ہے کیا نسبت ہے؟ اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا ظاہر ہے کہ خودی "تیر ما و تو" نہیں۔ جیسا کہ غالباً ڈاکٹر صاحب کو بھی تسلیم ہوگا۔

پڑھنے والوں کو مثنوی کے وہ حصے عجیب معلوم ہوں گے جہاں بیخودی میں ان باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جنہیں اقبال خودی کا طرۂ امتیاز کہہ چکے ہیں۔

"خودی با تمکین و قرار تلقین کند و بیخودی با اضطراب و ذوق عمل"

اضطرابِ عاشقی ہمچو آب است — زندگی را بیخودی سیلاب است
چوں خودی تلقین بہ تمکیں می کند — ذوق و شوق عشق را از ما برد

یہاں عاشقی اور بیخودی کو مترادف مان لیا گیا ہے۔ حالانکہ عشق اور عاشقی جیسے الفاظ خودی کے ساتھ بھی اتنی خوبصورتی سے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اور اقبال نے کئے ہیں۔

دیباچہ میں خودی، خودبینی، خودشناسی، خودآگاہی، اور خودپرستی جیسے الفاظ ہم معنی الفاظ کی طرح استعمال کئے گئے ہیں لیکن مثنوی میں یہ کہا گیا ہے کہ "انکشافِ حقیقت جس میں یقیناً خودآگاہی بھی شامل ہے وسیلۂ بیخودی سے ہوتی ہے اور خودی اس کے حصول میں مانع ہے"۔ بڑی حد تک یہ بات ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن کب؟ جبکہ خودی کا مطلب خودپرستی ہو اور بیخودی کا مطلب صرف خودپرستی کا انکار۔ لیکن نہ تو اقبال کے نزدیک خودی خودپرستی ہے نہ شاید سرود بیخودی کا مصنف اپنے تصور کو خودپرستی کی نفی کی حد تک محدود سمجھتا ہے۔ لہٰذا تضاد دور ہوتو کیونکر ہو۔

بایں ہمہ مثنوی کے بہت سے مقامات مصنف کے گہرے فلسفیانہ رجحان، غور و فکر اور شاعرانہ صلاحیت کا بہت عمدگی سے مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ خودی کا اقتضا حدود و بندیٔ وطن اور امتیاز قوم و ملک ہے۔ جبکہ بیخودی فلسفۂ سیاست بین الاقوام کا اثبات کرتی ہے۔

ایں زمیں از ملت و ملک و وطن — خوش نباید لایق ساز لیستن
ایں زمینِ ما و تو ملک خداست — ہر کجا خواہیم روم بر من رواست

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

ہر کسے در فکر حاضر بودہ است — ہم خود صد رنجہا افزودہ است

چشم بکشا روز فردا ہم ببیں — بیخودی ما را شود چوں جاں گزیں
از مذاق روز فردا بے خبر — جز بہ حاضر شد نہ انساں را نظر
پیش از یکدم نہ بیند چوں کسے — بر خودی پالیدہ مانند خوش بسے
وانکہ شد از روز فردا ہم خبر — بر خودی آمد نشد یک دم نظر
وقت چوں پابند ماہ و سال نیست — بیخودی جز بہر ما احوال نیست

تو کہ خود را وقف کردی بہر خویش — از غم انساں نداری جان ریش
من کہ بہر دیگراں سوزم تمام — بہر انساں اشک ریزم صبح و شام
نوع انساں را چناں منظر دہم — ایں زغال خشک را اخگر دہم
اے مثال شمع روشن کن جہاں — کو ہمی سوزد برائے دیگراں
گر خودی را در عمے بگذاشتی — نوع انساں را بلند افراشتی
ہر کسے از یک خودی در صد محن — خوش بروں آ اے ز تاریخ کہن
کس ندارد جز ہوائے خویشتن — ہر کسے باشد برائے خویشتن
ہیچ کس از بیخودی از خود نرست — نوزدہ صد سال مقابل در گذشت
جز خودی چوں کس نہ بیند ہیچ کس — بندۂ در بند تو شد چوں مگس
از خودی گر تو فروزاں آمدی — نوع انساں را پشیماں آمدی
از خودی چوں احتراق دیگر است — باز در عالم نفاق دیگر است
باز دیگر قلب انساں تنگ شد — باز در عالم صلائے جنگ شد
گر خودی باشد پے تقریب ما — غرق خواہد شد چنیں تہذیب ما
از فساد و جنگ بگذر اے سالے — را آنکہ گردد نیست زنہار عالمے

مثنوی کے بعد کتاب کے آخر میں "بادہ تلخ" کے عنوان سے غزلیں درج کی گئی ہیں۔ جن کے مضامین بیشتر فلسفہ بیخودی ہی سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان کی شمولیت بالکل مناسب کہی جا سکتی ہے۔ غزلیں عموماً فارسی اساتذہ کی مشہور زمینوں میں ہیں۔

ایک دو جگہ اشعار میں گڑبڑ بھی معلوم ہوئی۔ مثلاً "ہیں چہ باید کرد اے انساں نو" کے تحت دو اشعار ملتے ہیں ؂

آدمی را ذوق آدم چوں شود — ہر کسے از بیخودی بے چوں شود
اے میالا خویش را از ننگ خودی — مشرے باید بجنگ بے خودی

یعنی مجموعی حیثیت سے مثنوی شگفتہ ہے اور جا بجا اس میں ایسے اشعار ہیں جو بلاشبہ قابل تعریف ہیں۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی کے لحاظ سے کتاب عمدہ ہے۔

(ل۔ ق)